ہفت روزہ
لیل و نہار
۱۴ فروری ۱۹۷۱ء

یہ ہے چانسلر کی وعدہ خلافی کی داستان

A meeting between the Vice-Chancellor and the representatives of Karachi University Teachers Society was held on Monday, 11 January, 1971, at 11.30 A.M. in the office of the Vice-Chancellor. The following attended:-

1. Vice-Chancellor
2. Dr. M. A. H. Qadri
3. Dr. M. Atiqullah
4. Dr. M. H. Qazi
5. Dr. Mohammad Yusuf

The Vice-Chancellor conveyed the assurance of the Chancellor that the Ordinance will be revised as soon as it is possible and that action was already underway. The Chancellor, however, regretted that because of the necessity of consulting other governments he could not give a firm date by which the new Ordinance would be promulgated.

2. It was agreed that recommendation will be made to the Syndicate and the Government that there should be a single grade of lecturers [illegible]-1,330 and that Efficiency Bar will be crossed in accordance with the criteria of three years teaching experience at the Honours and Postgraduate level and demonstrated research ability.

3. It was also agreed that the criteria prescribed for Associate Professors would be applied to the existing lecturers and if they come up to the standard prescribed a corresponding number of posts of Associate Professors will be advertised and they will be appointed and their post will be upgraded if the applicant lecturers are found suitable for appointment as Associate Professors under the existing Ordinances and Regulations.

4. If these conditions are acceptable to the Teachers Society and they withdraw the strike notice the Syndicate will take action as soon as possible.

I. H. Qureshi 11/1/71 [illegible] [illegible] [illegible]

ہفت روزہ کراچی
لیل و نہار

جلد ۲ | ۱۵ تا ۲۱ فروری ۱۹۷۱ء | شمارہ ۷

ادارہ تحریر
فیض احمد فیض ——— حسن عابدی
امین مغل لاہور ——— احمد الیاس ڈھاکہ





فون نمبر ——— ۴۱۷۴۹۸

قیمت
مغربی پاکستان میں ——— ۶۰ پیسے
مشرقی پاکستان میں ——— ۷۵ پیسے
گوادر رپسنی میں ——— ۷۰ پیسے
برطانیہ میں ——— ہشلنگ ۶ پنس

پوسٹ بکس ۳۱۷۸ کراچی ۲۹

اندیشۂ سود و زیاں

لاہور میں ہندی طیارے کی تباہی سے وہی نتائج برآمد ہوئے جن کا خدشہ تھا، دہلی میں ہمارا سفارت خانہ جن سنگھی اور مہا سبھائی فسادیوں کے نرغے میں ہے۔ بڑودہ اور احمد آباد میں مسلمانوں کی جانیں تلف ہو رہی ہیں، فرقہ پرست جماعتوں کے دباؤ میں آکر اور انتخابات میں اپنا بھرم رکھنے کی خاطر اندرا حکومت نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان پاکستانی طیاروں کی پرواز بند کردی ہے اور کسی ثبوت یا جواز کے بغیر ہوائی اغوا کی ذمہ داری حکومتِ پاکستان کے سر تھوپ دی ہے۔ ردِ عمل کے طور پر پاکستان میں بھی ہندوستانی سفارت خانوں کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے گویا دونوں جانب کشیدگی بڑھ رہی ہے، جذبات مشتعل ہو رہے ہیں۔ اور دونوں ملکوں میں ٹکراؤ یا (CONFRONTATION) جو اب تک محض نظریاتی یا خیالی چیز تھی ایک بھیانک حقیقت بن چکا ہے، تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اپنے گھر میں مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت اور اس کے رہنما اس واقعے کی مذمت میں مشغول ہیں اور مغربی پاکستان کی سب سے معتبر سیاسی جماعت اور اس کے رہنما مدح سرائی میں مصروف، ایک ہی سیاسی جماعت یعنی کونسل مسلم لیگ کے ایک لیڈر سردار شوکت حیات صاحب کشمیری نوجوانوں کے اس اقدام سے ناخوشی کا اظہار کر رہے ہیں تو دوسرے رہنما ایئر مارشل نور خاں صاحب ان کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ اور تو اور آزاد کشمیر کے منتخب صدر سردار عبدالقیوم صاحب نے بھی طیارے کی تباہی کی مذمت کی ہے جس کے جواب میں دوسرے کشمیری رہنما سردار صاحب کی مذمت کر رہے ہیں۔ عوامی لیگ کے ایک ترجمان اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ دیگر اشتعال انگیز کارروائیوں کی طرح بہت ممکن ہے کہ یہ کارروائی بھی پاکستان میں جمہوریت کے قیام اور عنانِ حکومت عوامی نمائندوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کے خلاف کوئی درپردہ سازش ہو،

لیعنی درونِ خانہ بھی افتراق ہے بیرونِ در بھی خلفشار،

ہم ایک گزشتہ اشاعت میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ کسی مسئلے کے بارے میں بحث و فکر کے لئے عوام دوست اور باشعور لوگوں کا معیارِ خیر و شر یا پیمانۂ سود و زیاں کیا ہونا چاہیئے۔ یہ پیمانہ ہے اوّل خویش یعنی اپنے عوام کی بھلائی اور ان کی مشکلات کا مداوا۔ دوم ان قرابت دار عوام کی بھلائی جن سے ہمارے خونی، دینی اور تاریخی رشتے ہیں جیسے اہلِ کشمیر یا ہندی مسلمانوں سے ہیں۔ سوم عوام کی عالمگیر برادری کی بھلائی اور داخلی اور خارجی جبر و استحصال سے ان کی نجات،

یہ معیار ذہن میں رکھیئے اور مسئلہ کشمیر، ہند و پاکستان کے باہمی اختلافات اور برصغیر کی گزشتہ تئیس برس کی سیاسی تاریخ پر نگاہ ڈالئے تو دو چار حقائق سامنے آتے ہیں پہلی بات یہ ہے کہ گزشتہ تئیس برس میں سبھی حکومتیں اہلِ کشمیر کی جہدِ آزادی کی تائید و حمایت کا دم بھرتی رہی ہیں لیکن اس دوران میں ہم اس جہاد کو تو کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچا سکے البتہ اس کے نام پر ہم نے اپنے عوام کو مظلوم سے مظلوم تر اور مجبور سے مجبور تر بنانے میں ضرور کامیابی حاصل کی ہے، سیفٹی قوانین بنائے گئے، تحریر و تقریر پر پہرے بٹھائے گئے، بغداد پیکٹ اور سینٹو، سیٹو کی زنجیریں گلے میں ڈالی گئیں، ایک تباہ کن جنگ کا سامنا کیا، بیش قیمت جانوں کی قربانی دی، دفاعی مصارف میں بے اندازہ اضافہ کیا اور قومی معیشت کی اس وقت جو تشویشناک صورتِ حال ہے سب پر ظاہر ہے، نتیجہ یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام کا تو اب تک کوئی خاص بھلا نہیں کر سکے لیکن اپنے عوام کی غلامی اور تباہ حالی میں ضرور اضافہ کر سکے ہیں، اس سے ہرگز ہرگز یہ مراد نہیں کہ ہمیں اہلِ کشمیر کی سرفروشانہ سرگرمیوں میں ان کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے تھا یا اب اُن کی امداد سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیئے، اس سے یہ بھی مراد نہیں کہ موجودہ

صورتِ حال کی ذمہ داری کلّی طور پر ہمارے حکمراں طبقوں پر ہے اور ہندوستان کے اربابِ اقتدار اس سے بری الذمہ ہیں، یقیناً اس میں اُن کی عوام دشمن حکمتِ عملی کو بھی اتنا ہی دخل ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کشمیر اور اہلِ کشمیر سے تمام تر محبّت اور لگن کے باوجود اپنی سیاست اور معیشت کی اصلاح کے بغیر ان کے اصلاحِ احوال کی تدبیر کیونکر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ہاں کسی مضبوط اور مستحکم آزاد جمہوری اور فلاحی معاشرے کی تشکیل نہیں کر پاتے، ہم کسی اور مقہور اور مظلوم معاشرے کے نجات دہندہ کیونکر بن سکتے ہیں، اپنے گھر کی بربادی سے ہمسائے کے گھر کی آبادی کا سامان کیسے بہم کیا جا سکتا ہے اور اپنے بازو توڑ کر کسی عزیز کی خاطر شمشیر کیوں کر چلائی جا سکتی ہے، اور جیسا کہ ہم ان صفحات میں پہلے لکھ چکے ہیں اس حقیقت کا احساس صرف ہمیں پر فرض نہیں، ہمارے کشمیری احباب و اعزا پر بھی واجب ہے جس طرح پاکستانی عوام اُن کی جہدِ حریّت میں ان کے ساتھی اور رفیق ہیں اسی طرح انہیں بھی پاکستانی عوام کے مفادات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اور کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیئے جس سے آزادی، جمہوریت اور معاشی انصاف کی جدوجہد میں ہمارے عوام کے لئے مشکلات پیدا ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر پچاس لاکھ اہلِ کشمیر ہمارے عزیز اور قرابت دار ہیں تو سات کروڑ ہندی مسلمان بھی تو اغیار نہیں، اگر ہم اہلِ کشمیر کا دُکھ درد اپنے رگ و پے میں محسوس کرتے ہیں تو اس سے کہیں زیادہ کثیر آفت زدہ مخلوق کے رنج و آلام محسوس کرنے کے لئے بھی تو ہمارے دل میں کوئی جگہ ہونی چاہیئے۔ اگر ہم کشمیری عوام کی آزادی اور حقِ خود مختاری کے حصول کی خاطر ان کی امداد و اعانت اپنا فرض گردانتے ہیں تو کیا ہندی مسلمان عوام کے ابتلا میں ہماری قطعی کوئی ذمّہ داری نہیں ہے؟ جس طرح ہمیں دعویٰ نہیں ہے کہ مقبوضہ کشمیر پاکستانی علاقہ ہے جسے بزورِ شمشیر حاصل کر لینا ہمارا حق ہے، اسی طرح ہم یہ بھی دعویٰ نہیں کرتے کہ ہندی مسلمان پاکستانی باشندے ہیں جن کے جان و مال کا تحفّظ ہمارا کوئی قومی فریضہ ہے، لیکن جس طرح ہم نے اہلِ کشمیر کی امداد و اعانت کے علاوہ یہ احتیاط بھی اپنے پر عائد کر رکھی ہے کہ ہماری جانب سے کوئی ایسا اقدام نہ ہو جس سے اُن کے قومی مفاد کو گزند پہنچے، انصاف کا تقاضا ہے کہ اسی نوع کی احتیاط ہندی مسلمان عوام کے بارے میں بھی ہمارے پیشِ نظر رہے جس کے معنی یہ ہیں کہ بھارت کے جن سنگھی اور مہاسبھائی درندوں کو ہماری جانب سے خوئے بد کی تسکین کا کوئی ایسا بہانہ بہم نہ پہنچے جس سے ان کے مظالم کا دائرہ اور وسیع ہو!

تیسری بات یہ ہے کہ ہندوستان کی وسعتوں میں صرف ساہوکار، بنیئے، سرمایہ دار، جن سنگھی اور مہاسبھائی ہی نہیں بستے، مظلوم کسانوں، مفلس مزدوروں کا ایک انبوہ وہاں بھی ہے جنہیں نہ اہلِ کشمیر کو غلام بنائے رکھنے سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے نہ مشرقی پاکستان کے دریاؤں کا پانی روکنے سے روٹی کپڑا بہم پہنچتا ہے لیکن اسکے باوجود وہاں کے فرقہ پرست عناصر اور مفاد پرست اربابِ اقتدار نے ان کی آنکھوں پر تعصّب، فرقہ پرستی اور پاکستان دشمنی کی ایسی پٹیاں باندھ رکھی ہیں کہ وہ اپنے بھلے بُرے میں تمیز نہیں کر سکتے۔ انہیں صحیح فکر اور بینائی تو انہیں کے اہلِ دل اور اہلِ نظر بخش سکتے ہیں لیکن اگر ہم اپنے عوام کے عقل و شعور اور بصیرت و بینائی کو فروغ دے سکیں تو شاید اس کا کچھ نور چھن کر اُدھر بھی پہنچ جائے، لیکن اگر اس کے خلاف ہمارے اربابِ سیاست اپنی دکان چمکانے کی خاطر اپنے عوام سے عقل و دانش کی روشنی چھیننے کے درپے رہیں تو دونوں جانب تو وہ اندھیرا اور بھی گہرا ہوتا جائے گا جس کی گود میں قتل و غارت، خوف و دہشت اور سبھی طرح کے جرائم اور مظالم پرورش پلتے ہیں۔

ہمارا روئے سخن صرف اپنے ملک کے عوام دوست اور باضمیر افراد ہی سے نہیں نہ وہ یکطرفہ طور سے یہ گتھیاں سلجھا سکتے ہیں، ہمارا خطاب ہمسایہ ملک کے معقول اور ترقی پسند عناصر سے بھی ہے، اُن پر بھی یہ فرائض عائد ہوتے ہیں کہ وہ اپنے عوام اور اپنی حکومت کو معقول اور منصفانہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور کریں اور انہیں ہر مسئلے کو مفاد پرستی، فرقہ داری اور پاکستان دشمنی کی عینک لگا کر دیکھنے کے بجائے دونوں ملکوں کی عوامی بھلائی کی روشنی میں دیکھنا سکھائیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ کشمیری حریّت پسندوں کی نہ پاکستان کے عوام سے لڑائی ہے نہ ہندوستان کے عوام سے، اُن کی جنگ ہند سرکار اور ہند کے رجعت پسند فرقہ پرست طبقوں سے ہے۔ اس جنگ میں انہیں پاکستان کی سبھی سیاسی جماعتوں اور ہندوستان کی بھی بعض روشن خیال ترقی پسند جماعتوں کی ہمدردی حاصل ہے۔ ان کی اپنی کوششوں کے علاوہ ان کی کامیابی کی ایک ضمانت یہ بھی ہے کہ انہیں نہ صرف یہ ہمدردی حاصل ہے بلکہ ان کے ہمدردوں کی قوت میں اضافہ اور ان کے دشمن کی صفوں میں کمی ہو، ان کے لئے اپنی جنگ میں ہر حربے کا استعمال جائز ہے بشرطیکہ اس کی زد ان کے دشمنوں کے بجائے ان کے دوستوں پر نہ پڑے، بدقسمتی سے لاہور میں ہندوستانی طیارے کی تباہی کا فیصلہ کرتے وقت انہوں نے اس مسئلے کے سب پہلوؤں پر غور نہیں کیا۔

ڈھاکہ سے ایک خط : احمد الیاس

۱۴ فروری، مستقبل کی سیاست کا محور بن گئی

عوامی لیگ کی مجلس عاملہ دُور رس فیصلے کرے گی.

کیا شیخ مجیب، بھٹو کے مقابلے میں رجعت پرستوں کی "دوستی" پر اعتماد کرلیں گے؟

عوامی لیگی سربراہ شیخ مجیب الرحمن ۱۴ فروری کو اپنی پارٹی کے اہم لیڈروں سے ملک کی موجودہ صورتِ حال پر تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔ اس موقع پر عوامی لیگ کی صوبائی و قومی اسمبلی کے اراکین کا مشترکہ جلسہ بھی منعقد ہو رہا ہے۔ اور پارٹی کی صوبائی و مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس بھی ہو رہے ہیں۔

عوامی لیگ کے یہ اجلاس ایک ایسے موقع پر ہو رہے ہیں جب پاکستان صحیح معنوں میں نازک سیاسی صورت حال سے دو چار ہے۔ ملک کی اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے عوامی لیگ کے لیڈروں کو اس بات کا احساس ہے کہ ان کے کاندھوں پر دستور سازی کا عظیم بوجھ آن پڑا ہے۔ اور مشرقی پاکستان کے عوام نے انہیں پاکستان کے پہلے عام انتخابات میں اپنی نمائندگی کا حق دے کر اُن کو ایک ایسی آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ اگر وہ عوام سے کئے گئے وعدے پورے کرنے میں ناکام رہے تو ان کی سیاسی موت یقینی ہے اور دوسری طرف اگر انہوں نے مغربی پاکستان کے عوام کی خواہشات اور امنگوں کے برخلاف کوئی دستور تیار کیا تو پھر "جمہوریت" کے وہ تمام دعوے غلط ثابت ہوں گے۔ جو انہوں نے جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کی ابتدا کرتے ہوئے عوام سے کئے تھے۔

سیاسی مبصرین کے نزدیک ملک کی موجودہ اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال بھی عوامی لیگ کی مرکزی قیادت کیلئے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ایک طرف ملک کو درپیش اقتصادی مسائل اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال ہے۔ جو اس بات کا تقاضہ کرتی ہے۔ کہ اشیائے صرف کی بڑھتی ہوئی گرانی بے روزگاری، صنعتی علاقوں میں بے چینی اور معاشی بحران پر قابو پانے کے لئے جلد از جلد اب ان پروگراموں پر عمل کیا جائے جنہیں عوام نے شرف قبولیت بخشا ہے۔ دوسری طرف وہ اہم سیاسی مسائل ہیں جو گذشتہ ۲۳ برس کے دوران میں ملک کے مختلف صوبوں اور دونوں بازوؤں کے درمیان دوری، کشیدگی بے اعتمادی، سیاسی کشمکش اور علاقائی چپقلش کو پروان چڑھاتے رہے ہیں۔ اور جس کے نتیجے میں آج بھی کہیں لسانی فسادات ہو رہے ہیں تو کہیں مذہبی جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں۔ کہیں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کی جا رہی ہے تو کہیں ملک کے خارجی مسائل الجھائے جا رہے ہیں۔ سیاسی مبصرین کے خیال میں ان حالات کو مستقل طور پر ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے نمائندوں کو جلد از جلد یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ اپنے پروگراموں کے مطابق گذشتہ ۲۳ سال میں پیدا ہونے والے ان مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔

اس پس منظر میں عوامی لیگ کے آئندہ اجلاس بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم ان عوامل کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو عوامی لیگ کے اس اجلاس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ملک میں بالخصوص مغربی پاکستان میں ایک ایسی کشیدہ فضا پیدا ہو گئی ہے جس کا مشرقی پاکستان کے سیاسی حلقوں پر شدید ردِ عمل ہوا ہے۔ مغربی پاکستان میں پچھلے چند دنوں کے اندر جو واقعات پیش آئے ہیں ان میں سرفہرست کشمیری حریت پسندوں کی جانب سے بھارتی مسافر بردار طیارہ گنگا کا اغوا اور اس کی تباہی ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے مشرقی پاکستان کے سیاسی حلقوں بالخصوص عوامی لیگ جیسی ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کو

(باقی صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

یہ فالتو زمین پہلے کہاں تھی؟

بورڈ آف ریونیو پنجاب کے ایک رُکن نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ صوبے میں ۸۳ لاکھ ایکڑ قابل کاشت سرکاری زمین بیکار پڑی ہے اور حکومت اب اس زمین کو بے زمین کاشتکاروں پر تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دریائے سخاوت اچانک جوش میں کیوں آیا ہے لیکن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ گذشتہ ۲۳ سال میں یہ فاضل زمینیں بے زمین کاشتکاروں میں کیوں تقسیم نہیں کی گئیں۔ ملک میں بار بار اناج کا کال پڑا اور اب بھی ہے۔ حکومت کو اناج کی بھیک مانگنے کے لئے دَر دَر پھرنا پڑا۔ اور ملک کے عزّت و وقار کو قربان کر کے "تھینک یو" امریکہ کا طوقِ غلامی پہننا پڑا۔ متعدد بار "پیداوار بڑھاؤ" کی مہم شروع کی گئی۔ ایوب خاں کی نام نہاد "زرعی اصلاحات" کا ڈھونگ رچایا گیا۔ کسان کمیٹیوں نے بار بار مطالبہ کیا کہ بنجر سرکاری زمینوں کو کاشت کاروں میں بانٹ دیا جائے لیکن بورڈ آف ریونیو کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بنجر زمین کوئی پوشیدہ خزانہ نہیں کہ اچانک دریافت ہو گیا ہو۔ ایکڑ دو ایکڑ زمین ہوتی تب بھی کہا جا سکتا تھا کہ پٹواری کے کھاتے پہ درج نہ تھی، ۸۳ لاکھ ایکڑ زمین تو ڈھکی چھپی چیز نہیں۔

افسر شاہی کی اس مجرمانہ غفلت سے عام اندازے کے مطابق پاکستان کو ہر سال دس من فی ایکڑ کے حساب سے تقریباً آٹھ کروڑ من اناج کا خسارہ ہُوا ہے یعنی گذشتہ ۲۳ سال میں ۲ ارب من اناج کا یعنی تقریباً ۲۵ ارب روپے کا۔ ذرا سوچیے کہ یہ زمین اگر کاشت ہوتی تو پاکستان کتنی مصیبتوں سے بچ جاتا۔ اسے قیمتی زرِمبادلہ خرچ کر کے دساور سے اناج نہ منگانا پڑتا، وہ پی۔ ایل۔ ۴۸۰ کی لعنتوں سے محفوظ رہتا جس کے تحت اناج بیچ کر امریکہ نے پاکستان میں ایک ارب روپیہ اپنے کھاتے میں جمع کر رکھا ہے اور اس رقم سے اپنے حواریوں کی مالی امداد کرتا ہے۔

پنجاب اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے کامیاب اُمیدوار مسٹر عبدالحفیظ کاردار نے فالتو اراضی کے بارے میں بورڈ آف ریونیو کے اعلان پر سخت حیرت کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اس زمین کی عاجلانہ تقسیم کی بجائے بہتر ہوگا کہ اس کے بارے میں تفصیلات مہیا کی جائیں، اور تقسیم کا کام صوبے کی آئندہ حکومت کے سپرد کر دیا جائے۔ اتنے وسیع رقبہ آراضی کا طویل عرصے تک بیکار پڑا رہنا، انتہائی افسوسناک ہے، چنانچہ مسٹر کاردار نے اپنے بیان میں اس "مجرمانہ کوتاہی" کے ذمہ دار افراد کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کیا ہے اور سوال کیا ہے کہ یہ کام جو آجکل کے لئے اُٹھا رکھا گیا تھا، آخر اب سے پہلے کیوں پورا نہیں کیا گیا۔ یہ مطالبات بالکل جائز ہیں۔ ان میں اضافے کی گنجائش محض اتنی ہے کہ حکومت کو دوسرے صوبوں میں بھی حالات کا جائزہ لینا چاہیے۔ کون جانے، کتنی سرکاری آراضی کہاں کہاں ویران پڑی ہو، اور جو کنبے انھیں آباد کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، وہ بے خانماں اور دانے دانے کے محتاج ہوں۔

ساتواں صفحہ

اصنافِ ادب میں ایک تازہ اضافے کی خبر ملی ہے۔ ناول، افسانہ، نظم، غزل، واسوخت، رباعی، اگر آپ لکھتے ہیں تو لکھتے رہئیے۔ لیکن نمبر پلیٹ لکھنے میں بات ہی اور ہے۔ جو لوگ کار رکھتے ہیں، اُن کے لئے اُردو میں نمبر پلیٹ لکھے یا لکھوائے بغیر چارہ نہیں۔ جی ہاں لکھوانا، بھی ایک تخلیقی ہُنر ہے۔

ایک ناول نگار خاتون کے لئے سُنا ہے کہ گزشتہ دنوں گھر سے کار میں نکلیں، نمبر پلیٹ انگریزی میں دیکھ کر کسی لڑکے نے پتھر اٹھایا اور شیشے پر کھینچ مارا۔ ونڈ اسکرین کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ بیٹھے بٹھائے تین چار سو روپوں کی چوٹ پڑ گئی۔ زندگی بھر افسانے لکھے، ناول لکھے، انشائیے بھی بہت لکھے، لیکن اُردو میں نمبر پلیٹ اگر نہیں لکھا تو کچھ نہیں لکھا۔

ایک تو سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اُردو سے اپنی محبت اور شفقت کا مظاہرہ آخر ہم کہاں کریں۔ ذریعۂ تعلیم، اگر تعلیم کہیں رہ گئی ہے تو وہ انگریزی ہے۔ ڈگریاں انگریزی میں ملتی ہیں۔ انٹرویو اور ملازمت سے انکار انگریزی میں ہوتا ہے۔ سرکاری محکموں میں ساری لکھا پڑھی انگریزی میں نجی کمپنیوں کی معاملت، کسٹم چونگی، امپورٹ ایکسپورٹ سب انگریزی میں پریس کانفرنسیں انگریزی میں سوال وجواب انگریزی میں کہیں کہیں تار اور منی آرڈر کے فارم ضرور اردو میں چھپے ہیں، لیکن صحیح پڑھے نہیں جاتے اور جواب مضمون اردو میں لکھنے کی مشق سب کو نہیں لہٰذا دو فقرے انگریزی میں چٹ پٹ لکھ کر فارغ ہو گئے۔ حد تو یہ ہے کہ اِن دنوں ایک جماعت کھالوں کے ساتھ ساتھ اُردو کی حمایت میں دستخط جمع کر رہی ہے (کھال اپنے لئے اور دستخط اردو کے لئے) سو وہ بھی انگریزی میں چلے آرہے ہیں۔ جہاں زندگی میں انگریزی کے عمل دخل کی یہ کیفیت ہو، وہاں بیچارا لکھا پڑھا آدمی اُردو سے اپنی شفقت برتنے کے لئے آخر کس دیوار سے سر پھوڑے بس بہت انگریزی ہو چکی اور کچھ نہ سہی، لیکن نمبر پلیٹ تو اب اردو میں ہی لکھنا پڑے گا۔

بیچارے ایک سادہ دِل مسلمان نے کہا تھا کہ روزہ میں نہیں رکھتا، تراویح میں نہیں پڑھتا، سحری کے وقت میری آنکھ نہیں کھلتی۔ اَب کیا افطار بھی نہ کھاؤں اور بالکل ہی کافر ہو جاؤں۔ اُردو کے بارے میں ہمارا اپنا یہی کہنا ہے کہ اب کیا بالکل ہی انگریز ہو جائیں۔

ایک صاحب اپنی کار میں کہیں سے آرہے تھے کہ چند لڑکوں نے روک لیا۔ سوال ہوا، یہ نمبر پلیٹ اردو میں کیوں نہیں؟ انہوں نے معذرت کی اور پوچھا، نمبر پلیٹ کو اُردو میں کیا کہتے ہیں؟ لڑکے اس جواب کے لئے تیار ہو کر نہیں آئے تھے، بہت سٹپٹائے۔ انہوں نے لڑکوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور کار اسٹارٹ کر کے بڑی تمکنت سے آگے روانہ ہوئے، لیکن دوسرے موڑ پر لڑکوں کی جو ٹولی کھڑی تھی، اس کے پاس علمی مباحث کے لئے بالکل وقت نہیں تھا، اس لئے انہوں نے نہ تو کار کو رُکنے کا اشارہ کیا اور نہ سوال وجواب کا موقع آنے دیا۔ نمبر پلیٹ کے سلیس اُردو ترجمے سے بھی بال بال بچ گئے، اور پتھر اٹھا کے وہیں شیشے پر کٹن سے رسید کیا۔ اب انہیں شیشے کی قیمت کے علاوہ نمبر پلیٹ کا ترجمہ بھی خود ہی مہیا کرنا ہوگا۔ قومی زندگی میں ایسے مراحل بہت آتے ہیں۔ جہاں جہد آزما ہاتھ کا ایک پتھر، علوم کے پورے دفتر پر بھاری ہوتا ہے ؎

لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

ہمیں یاد ہے کہ چند سال پہلے لاہور میں اُردو کے سائن بورڈ اور نمبر پلیٹ لکھوانے کا کام ڈاکٹر سید عبداللہ نے شروع کیا تھا۔ دراصل اُن دنوں ادب میں جمود کا بڑا چرچا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سوچا ہوگا کہ لاہور کا ادیب، فی الحال اس سے کچھ زیادہ لکھنے کا اہل بھی نہیں۔ چنانچہ پہلے تو وہ ادیبوں اور شاعروں کے خاموش جلوس نکالتے رہے اور یہ بھی اچھا ہی تھا، ورنہ اس جلوس میں ایسے ادباء اور شعراء دیکھے گئے جو فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے پورا ناول سُنا دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ اگر ایک بار "مصرع عرض ہے" کہہ دیتے تو پھر کوئی مائی کا لال اُن کا مُنہ نہیں بند کر سکتا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر عبداللہ سیاست داں ادیب ہیں ان کی دُور اندیشی نے کام کیا۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے فٹ پاتھ پر وہ خاموش جلوس دیکھے، وہ بھی سناٹے میں رہ گئے کہ زبان داں اور اتنے خاموش۔ ضرور اُردو پر کوئی بہت ہی بُرا وقت پڑا ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے دکانداروں کو اُردو کا قائل کر دیا۔ بہت سے کیمسٹ اینڈ ڈرگسٹ، کیفکشنرز اینڈ بیکرز، امپورٹرز اور ایکسپورٹرز اپنے سائن بورڈ پر انگریزی کے پہلو میں اُردو کو جگہ دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن معاملے میں پیچ انہوں نے بھی بہت ڈالے، اور ڈاکٹر صاحب کو ترجمے کی بحث میں اُلجھانا چاہا۔ بعض ترجمے جو آسانی سے مہیا ہو سکتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے وہ تو بھجوا دیئے، بلکہ سُنا یہ تھا کہ انجمن اُردو کے خرچ پہ بورڈ لکھوا بھی دیئے البتہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہو سکا اور ہوتا بھی تو کیا ہوتا۔

انہی دنوں کچھ پُرجوش اردو دوستوں نے اپنی کاروں کے نمبر پلیٹ اردو میں لکھوائے لیکن ٹریفک کے سپاہیوں نے اعتراض کیا کہ یہ ہم سے نہیں پڑھے جاتے۔ بلکہ ایک صاحب کا تو ٹکنیکل بنیاد پر چالان بھی ہو گیا کہ یہ وہ حروف تہجّی نہیں جو ٹریفک پولیس نے جاری کئے تھے۔ اردو کی خاطر چالان کروانے کا حوصلہ کتنے لوگ رکھتے ہیں۔ چنانچہ بات آگے نہ بڑھ سکی۔

بہرحال چند روزہ احتیاط کی بات ہے۔ کراچی میں یہ قصّہ کتنے دن رہے گا۔ کاغذ پر لکھی ہوئی نمبر پلیٹ، بارش کے ایک ہی چھینٹے سے دُھل جائے گی اور صاف ستھری انگریزی باہر آجائے گی۔ اب بھی انگریزی اور اردو کے درمیان کاغذ کے ایک باریک پردے کے سوا اور کیا ہے۔ البتہ جو لوگ کراچی سے باہر نکل کر حیدرآباد یا مضافات میں جاتے ہیں۔ انہیں انگریزی کے اوپر اردو اور اردو کے اوپر سندھی کی نمبر پلیٹ لکھوا رکھنی چاہیئے۔ کیونکہ معلوم نہیں کس سندھی بولنے والے کی غیرت کو جوش آجائے اور آپ اردو کے پتھر سے بچتے بچتے سندھی کے پتھر کی زد میں آجائیں۔

شکاری افسر، شکار نہیں کئے جاسکتے

بقر عید میں لوگ بکروں اور دنبوں کو روتے رہے کہ بہت مہنگے ہو گئے ہیں۔ لیکن نواب شاہ سے پیپلز پارٹی کے لیڈر قاضی محمد بخش نے خبر دی ہے کہ یہاں محض ایک تیتر کی قیمت دو سو روپے پڑتی ہے۔ دراصل انہوں نے اور طرح حساب کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ہر سرکاری افسر اپنا دورہ دیہات میں رکھتا ہے اور اس بہانے سے تمام وقت شکار میں گزارتا ہے۔ ٹی اے اور ڈی اے الگ وصول کرتا ہے اس طرح اس کے شکار پر سرکاری خزانے کے لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ افسروں کو شکار سے باز رکھا جائے۔

قاضی صاحب افسروں کو جو چاہیں کہیں، لیکن تیتر اور بٹیر کا شکار، شوق کی بات ہوتی ہے اور شوق کی کوئی قیمت نہیں، تیتر، بازار میں دو روپے کو بھی مہنگا ہے اور شکارگاہ میں دو سو روپے میں بھی سستا۔ شوق کی قیمت کس نے متعین کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیہاتیوں سے تقریب ملاقات کے لئے شکار کا مشغلہ بُرا نہیں۔ اسی بہانے سے کچھ اُن کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ ورنہ افسر معمولی سفر خرچ کمانے کے لئے گاؤں گاؤں گھوم کر دھول پھانکنے سے تو رہے۔ قاضی صاحب اگر نہیں چاہتے کہ افسر دیہات کا رُخ کریں تو پہلے یوں ہی سہی۔

بیورو کریسی، اس ملک کی غالباً سب سے مضبوط پارٹی ہے، برسرِ اقتدار آنے والی پارٹیاں اس سے نبٹیں، پھر بات ہے۔

بیکن نے ایک بار کہا تھا

کچھ کتابیں چکھنے کے لئے ہوتی ہیں، کچھ نگلنے کے لئے اور معدودے چند چبا کر کھانے اور ہضم کرنے کے لئے۔!

البتہ ہم نہایت ادب سے اس میں صرف اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ

اگر یہ رُوسی کتابیں ہیں تو آپ یقیناً ان میں سے ہر ایک کتاب کو جلدی جلدی نوالہ بنا لینا چاہیں گے۔

رُوسی کتابوں کی نمائش میں تشریف لائیے جو ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء سے ۲۱ فروری ۱۹۷۱ء تک جاری رہے گی۔

اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھائیے۔

رُوسی کتابوں کی اس نمائش میں سائنس، میڈیسن، فلسفہ، معاشیات اور آرٹ کی کتابیں ناول اور ٹیکنیکل کتابیں، بچوں، بڑوں، عورتوں اور مردوں کے لئے سندھی، بنگالی، اردو، انگریزی فارسی اور گجراتی میں دستیاب ہیں۔

اسٹینڈرڈ پبلشرز لمیٹڈ، میرینا ہوٹل کمپاؤنڈ

مقابل ریو سینما، بونس روڈ، صدر، کراچی ۴

ٹیلیفون نمبر ۵۱۱۲۲۱

میرزا غالب کی انسان دوستی

مولانا غلام رسول مہر

(مصنّف نے یہ مقالہ بین الاقوامی مذاکرۂ غالب منعقدہ لاہور میں پیش کیا)

میرزا غالب کی انسانیت دوستی کے بھی دو پہلو ہیں۔ اوّل وہ انسانیت کو اس کائنات کی تخلیق کا مرکزی سبب قرار دیتے ہیں۔ دوم وہ انسان سے بطور انسان کے محبت کرتے ہیں۔ ان کے یہاں رنگ، نسل، پیشے یا درجے کا کوئی تفاوت اس محبت میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔

آفاقیت۔ میرزا غالب کے کلام کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ اسے میرزا کی انسانیت دوست فطرت کا ایک طبعی خاصہ سمجھنا چاہیئے آفاقیت اور ہمہ گیری شعر کا جوہر حسن ہے۔ یعنی جو کچھ کہا جائے، وہ معنویت کے اعتبار سے ماحول کی حدوں کو توڑ کر زیادہ سے زیادہ عام ہو جائے۔ کسی خطے کی زبان یا کہنے والے کا معاشرہ یا اس کے رسوم و اوضاع اس کی عمومیت پر اثر انداز نہ ہو سکیں، اور کسی بھی پہلو سے اس کی ترجمانی فطرت انسانی مجروح نہ ہو سکے بلکہ دنیا کے کسی بھی انسان کو اس کی زبان میں وہ کلام سمجھا دیا جائے تو بے تامّل پکار اُٹھے:۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آفاقیت کے دو پہلو ہیں:۔ ایک یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ کسی خاص طبقۂ انسانیت نہیں پورے عالمِ انسانیت کے جذبات و احساسات کا ترجمان ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کلام کا خاصہ بڑا حصہ ایسا ہے جسے دین، فلسفے، نفسیات، سیاست، تاریخ، ادب وغیرہ ہر دائرہ علم وفن کے مباحث و مذاکرات میں استعمال کر سکتے ہیں اور اس کی موزونیت ہر بحث و ذکر میں برابر درخشاں رہے گی۔

میرزا غالب کی انسانیت دوستی کے بھی دو پہلو ہیں:۔ اوّل وہ انسانیت کو اس کائنات کی تخلیق کا مرکزی سبب قرار دیتے ہیں پھر انسان کے شرف و برتری کے اہم اصول و خصائص نئے نئے رنگ اور نئے نئے انداز میں پر تاثیر طریق پر جابجا پیش کرتے جاتے ہیں تاکہ ہر انسان وہ خصائص پیدا کر کے انہی برتری کو حقیقت ثانیہ بنا دے۔ دوم، وہ ہر انسان سے بطور انسان کے محبت کرتے ہیں۔ ان کے ہاں رنگ، نسل، پیشے یا درجے کا کوئی تفاوت اس محبت میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ ہر انسان کی خیر خواہی مرزا کی زندگی کا نصب العین بنی رہی۔ ان کے اپنے وسائل معاش کسی بھی دور میں زیادہ وسیع نہ رہے۔ جو تھے، وہ بھی بعض اوقات سکڑ کر بہت محدود ہو گئے۔ تاہم میرزا غالب کی سراپا ہمدرد فطرت نے نمود و نمائش میں کبھی انقباض گوارا نہ کیا۔ اس سلسلے میں تفصیلی بحث و نظر کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن موقع اور محل تفصیل کا متحمل نہیں۔ اور میں صرف چند جھلکیاں دکھانے پر قناعت کرتے ہوئے عرض کروں گا۔

تو خود حدیث مفصّل بخواں ازیں مجمل

میرزا کی ایک فارسی غزل کا شعر ہے۔

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بہ گردِ نقطۂ ما دورِ ہفت پرکار است

یعنی کائنات کے پیدا کرنے کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انسان وجود میں آئے۔ انسان ہی کی خاطر یہ وسیع و عظیم کارگاہ عدم سے وجود میں آئی، جو علم کی روشنی زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ پھیل پھیل کر بیکراں سی ہو جاتی ہے۔ ہر پرکار کوئی نہ کوئی نقطہ متعین کر کے گھمائی جاتی ہے۔ سات سیاروں کی پرکار جس نقطے پر گھوم رہی ہے۔ وہ آدم ہے۔ وہ انسان ہے۔

ہمارے ہاں ایک روایت مشہور ہے:۔ لولاک لما خلقت الافلاک، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود مبارک مقصود نہ ہوتا تو افلاک بھی پیدا نہ کئے جاتے میرے علم کی حد تک یہ حدیث تو نہیں، لیکن قول ہر اعتبار سے درست ہے کیونکہ انسان کائنات کا مرکز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کا مرکز و مرجع ہیں، لہٰذا یہاں جو کچھ ہے۔ وہ اسی ذات بابرکات کے طفیل ہے۔

پھر میرزا فرماتے ہیں کہ انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت پیش آسکتی تھی وہ اللہ تعالیٰ نے پہلے پیدا کیں۔ اور انسان کا ظہور ان کے بعد ہوا۔

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج باجانداں بود
پیش ازاں کایں نو رسد آں را مہیا کردہ ای

بیماریاں اور احتیاجات جاندار کے ساتھ تھیں اور ان کا علاج و مداوا معدنیات و نباتات پر موقوف تھا۔ حکیم مطلق کی شان کریمی ملاحظہ فرمائیے کہ جاندار کے دور سے بیشتر معدنیات و نباتات کے بے اندازہ ذخیرے ہر طرف پھیلا دیئے گئے۔

غرض میرزا کا بنیادی نصب العین انسانیت ہی تھا جس کے اعلیٰ اوصاف و محاسن کی دعوت ان کے کلام میں جابجا ملتی ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ جس شاعر نے انسان کے لئے یہ بلند نقطہ نگاہ اختیار کیا، کیا اس کے لئے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل ہونا چاہیئے کہ اس نے دنیا بھر کے انسانوں کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا، نیز وہ محض اسی خطے کا شاعر نہیں جس میں پیدا ہوا اور اس میں زندگی

فروری جشنِ غالب کا یادگار مہینہ ہے

غالب کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی نے یونیسکو کے تعاون سے ۲۸ر دسمبر سے ۳۰ر دسمبر تک لاہور میں بین الاقوامی مذاکرہ غالب ترتیب دیا تھا جس میں شرکت کے لئے انگلستان، ایران، افغانستان اور ترکی سے غالب شناس آئے تھے۔ غالب کی وفات فروری ۱۸۶۹ء میں ہوئی تھی اور ۱۹۶۹ء میں تمام علمی دنیا میں ان کا جشن صدسالہ منایا گیا۔ لاہور میں بین الاقوامی مذاکرہ غالب جشن صد سالہ کی تقریبات کی آخری کڑی تھی جو ۱۹۶۹ء کے بجائے ۱۹۷۰ء میں منعقد ہوئی۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر پاکستان کے علاوہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں غالب کی زندگی اور شاعری پر مذاکرے اور جلسے کئے گئے۔ انگریزی میں غزلیات کا ترجمہ کیا گیا۔ شکاگو یونیورسٹی میں غالب پر لیکچر دینے کے لئے پاکستان سے پروفیسر حمید احمد خاں، اور ہندوستان سے پروفیسر محمد مجیب اور پروفیسر آل احمد سرور مدعو کئے گئے لندن یونیورسٹی کے رالف رسل اور خورشید الاسلام کے کام کا ایک حصہ "غالب، زندگی اور خطوط" مکمل ہو کر سامنے آیا۔ چیکوسلواکیہ میں یان ماریک اور ہینش اسووا نے غالب پر تحقیقی کام کیا۔ روس میں رحمٰن بردی محمد جانوف اور ان کے ساتھیوں نے غالب کا ترجمہ کیا۔ اور مضامین لکھے۔ اٹلی میں بوسانی نے پروفیسر احمد علی کے تعاون سے غالب کو روشناس کرایا، ہندوستان میں ڈاکٹر یوسف حسین کی آہنگ غالب، پرتھوی چندر کی جاگیر غالب۔ ایس اے۔ آئی ترمذی کا فارسی میں غالب کے خطوط، اکبر علی خاں عرشی کا دیوان غالب نسخہ عرشی زادہ، پروفیسر مجیب کی تصنیف، مالک رام کی عیار غالب اور گل رعنا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پاکستان میں بھی اسی موقع پر غالب کی تمام اردو اور فارسی کی تصنیفات کو اہتمام سے شائع کیا گیا۔ غالب نمبر شائع کئے گئے اور غالب کی زندگی اور شاعری پر بے شمار کتابیں شائع کی گئیں۔

گذاری وبلکہ معنوی خدمت گذاری کے اعتبار سے وہ ان تمام خطوں اور ملکوں کا شاعر تھا، جن میں اس کے ہم جنس آباد ہیں۔ اسی طرح اس کی شاعری کسی خاص وقت اور خاص زمانے کے لئے نہ تھی بلکہ وہ ہر دور اور ہر عہد کا شاعر تھا۔

سوال یہ نہیں کہ جو کچھ کہا گیا وہ کس زبان میں تھا؟ کہنے والا کون تھا؟ اور کس دور میں اس نے کہا؟ سوال یہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا اگر وہ کسی خاص خطے اور خاص دور کے لئے نہ تھا تو اس کی شعر گوئی کو کیوں آفاقی نہ مانا جائے؟

خواجہ سنائی فرماتے ہیں

سخن کز روئے دیں گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہر حق جوئی، چہ جابلقا، چہ جابلسا

یہ اس حقیقت کی ترجمانی تھی، جس کی گذارش میں نے کی۔

اقبال بھی کہتے ہیں

نہ زباں کوئی غزل کی، نہ زباں سے باخبر ہیں
کوئی دلکشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

پھر فرمایا:۔

ترکی بھی شیریں، تازی بھی شیریں
حرفِ محبت نہ ترکی نہ تازی

میرزا غالب نے اشرف و برتر انسانیت کے جو اوصاف و خصائص بتائے، ان میں سے صرف چند کا ذکر یہاں اجمالاً پیش کروں گا:۔

ان میں سے میرے نزدیک سب سے بڑھ کر خصوصیت اس وصف کو حاصل ہے جسے ہم عموماً بے غرضی اور خلوص سے تعبیر کرتے ہیں یعنی انسان اپنے ہم جنسوں کی خدمت انجام دیتے ہیں کاملاً بے غرض ہو اور کسی خدمت کے لئے کوئی اُجرت، کوئی مزدوری اور کوئی بدلہ طلب نہ کرے بلکہ اعزاز بھی نہ چاہے یہ سمجھے کہ جو کچھ اسے کرنا ہے اسی عزم اور اسی یقین کے ساتھ کرے کہ زندگی میں اس کا وظیفہ یہی ہے۔

میرزا فرماتے ہیں:۔

شعلہ جکلہ عزم کرا؟ گل شگفتہ مزد کو؟
شمع شبستانیم، باد سحر گاہیم

میں شبستان کی شمع ہوں جو رات بھر جلتی ہے تاکہ اندھیرا نہ رہے اجالا رہے۔ رات بھر اس سے شعلے جھڑتے رہتے ہیں اور اس کے سوز و گداز میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بہ ایں ہمہ اس نے کبھی کسی غمگسار و غمخوار کی آرزو نہیں کی۔ پھر میں صبح کی ہلکی ہلکی ہوا ہوں، جو چلتی ہے تو کلیاں کھل کھل کر پھول بنتی جاتی ہیں۔ اس خدمت کے لئے بھی میں نے کبھی کوئی اُجرت طلب نہیں کی۔ اشرف و برتر انسان کو اپنے ہم جنسوں کی خدمت اسی طرح انجام دینی چاہیے جس طرح شمع رات کے وقت شبستان میں اور بادِ سحر صبح کے وقت باغ و چمن میں انجام دیتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی دعوتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ جب اپنی قوم کو دعوتِ حق دیتے تھے تو یہی فرماتے تھے کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ ہمارا اجر تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی شیوہ میرزا غالب کے نزدیک اشرف و برتر انسان کے لئے خدمت انسانیت کے سلسلے میں زیبا ہے۔

میرزا غالب اس امر کے بھی روادار نہیں کہ بہشت کو اس کی نعمتوں کی خاطر طلب کیا جائے۔ فرماتے ہیں:

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

میرزا تو جال پروانے بچھا کر پرندوں کی گرفتاری کو بھی نازیبا سمجھتے ہیں، کیونکہ جو پرندے دانوں کی خاطر جال پر گرتے ہیں، وہ دراصل تن پرور ہوتے ہیں، ان میں ذوقِ گرفتاری کیونکر فروغ پاسکتا ہے؟

تا یافت ہر کہ تن پرور بود
خوش بود گرد اندبخود دام ما
در دام بہر دانہ نیفتیم، مگر قفس
چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

میں دانے کی خاطر جال پر نہیں گر سکتا۔ مجھے گرفتار کرنے کا شوق ہے تو قفس کو اتنا بلند کردو کہ میرے گھونسلے کے برابر پہنچ جائے اور میں محض گرفتاری کے شوق میں گھونسلے سے قفس میں پہنچ جاؤں۔

اقبال نے بھی یہی فرمایا ہے

جس کا عمل ہے بے غرض، اس کا مقام اور ہے
حور و خیام سے گذر، بادۂ و جام سے گذر

انسانیت عالیہ کے خصائص میں ذاتی اغراض سے پاک ہونے کے علاوہ ایک اہم خصوصیت غیرت و خودداری کی بھی ہے۔ میرزا فرماتے ہیں:۔

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چیں پیشانی مرا!

فرض کیجئے کہ پیاس کے مارے میری جان لبوں پر آگئی ہو اور دریا سامنے آجائے جس سے تھوڑا پانی لے کر پیاس کی آگ بجھا سکتا ہوں، تاہم دریا کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں دیکھ کر میرے دل میں گمان گذرے کہ یہ لہریں نہیں۔ جو دریا کی طبعی خصوصیت ہیں بلکہ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی ہیں کہ یہ شخص کیوں میرے پانی سے پیاس بجھانے چلا آیا، تو میری غیرت و خودداری پیاس سے مر جانا گوارا کرے گی مگر دریا کے پانی کا ایک قطرہ بھی تب تک لے جانا حرام سمجھے گی۔ اسی غیرت و خودداری کی دعوت میرزا کے دوسرے اشعار میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا!
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم!
اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیے

اشرف انسان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہمت و مردانگی کا جوہر اعلیٰ پیمانے پر موجود ہو۔ میرزا فرماتے ہیں۔

مرد آنکہ در ہجوم تمنا شود ہلاک
از رشک تشنہ کہ بہ دریا شود ہلاک
نامرد رابہ لخلخۂ آسائش مشام
مرد از تف سموم بہ صحرا شود ہلاک

دیکھئے جن سر بفلک چوٹیوں کو آسماں جھک کر چومتا ہے، وہ مردانگی ہی کی بدولت سر ہوئیں۔ اتھاہ سمندروں کے سینے چیر کر جہازوں کے راستے پیدا کرنا جانبازوں ہی کا کام تھا۔ پھر بہادروں اور جوانمردوں ہی نے قطبین کے برفستانوں کی چھان بین میں جانیں لڑائیں۔ ہمت وروں ہی نے نئی زمینیں دریافت کیں۔ اب ستاروں پر کمندیں ڈالی جارہی ہیں۔ انسان اس طرح خلا میں تیرتے پھرتے ہیں جیسے تدیوں کی سطح پر پرندے تیرتے نظر آتے ہیں۔ غرض مردانگی ہی پر علم و فن کی ہر پیش رفت اور ترقی کا انحصار ہے۔ اور یہی تسخیرِ کائنات کے لئے سبقت و اقدام کی رُوح رواں ہے۔

مردانگی کے ساتھ محنت طلبی اور جفاکشی بھی لازم ہے کیونکہ حقیقی انسان کا سب سے بڑا وظیفہ ہم جنسوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت ہے۔ یہ وظیفہ ادا نہیں ہوسکتا جب تک انسان اپنے آپ کو سختی، شدت اور جفاکشی کا عادی نہ بنالے۔ میرزا کہتے ہیں۔

چہ ذوقِ رہروی آں را کہ خار خارے نیست
مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد!

جس سفر میں تکلیف، پریشانی اور افتاد کا کوئی اندیشہ نہ ہو، اس میں لطف ہی کیا ہے؟ نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے یہ بھی واضح ہے کہ انسان اصل کام میں جتنی مشقتیں اور مصیبتیں اٹھائے گا، تکمیل کار پر اسے اتنی ہی زیادہ مسرت و شادمانی ہوگی۔ دیکھئے اردو کے ایک شعر میں میرزا اسی مشقت طلبی اور مشکل پسندی کا اظہار کس ولولہ انگیز ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

پاؤں میں چھالے پڑ جائیں تو تلوؤں میں مہندی لگا کر پابند بستر ہو جاتے ہیں، لیکن میرزا کے نزدیک علاج و استراحت قطعاً شایانِ التفات نہیں۔ وہ راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا پاتے ہیں تو ان کا دِل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ انہیں چھالوں کا علاج کانٹوں ہی سے کرنا پسند ہے۔ خدمت گذاران انسانیت جب تک تکلیف و اذیت برداشت کر لینے کے عادی نہ ہو جائیں گے وہ خدمت کی راہ کے وظائف کیوں کر پورے کرسکیں گے؟

پھر میرزا کے نزدیک کانٹوں پر چلنا بجائے خود ایک نیکی ہے، اس طرح کانٹوں کی سوکھی ہوئی زبانوں کے لئے تری اور

نمی کا انتظام ہوگا۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
ایک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

میرزا کے نزدیک تو سرزمین حجاز میں کسی دریا کا نہ ہونا بھی قدرت کی ایک خاص مصلحت ہے۔ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ حرمِ محترم کی زیارت کا عزم لے کر اٹھتے ہیں، معلوم ہو سکے کہ تشنگی برداشت کر لینے کے اعتبار سے ان کے ذوق و شوق کا درجہ کیا ہے۔

عیارِ کعبہ رواں تا نہ تشنگی گیرند
نہ دادہ اند دراں دشت راہ دریا را

محنت طلبی اور جفاکشی کے شعر بھی بہت ہیں، مثلاً

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

زخم سلوانے میں مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان رنج کی عادت ڈال لے گا تو رفتہ رفتہ احساسِ رنج خود بخود کُند ہو جائے گا!

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

مجھے اس بحث کو طول نہیں دینا چاہیے۔ چند اور خصوصیتوں کی ایک ایک مثال سُن لیجئے:

قول اور فعل میں ہم آہنگی:

با خود گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گو
گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

صبر و ثبات:

دو زند اگر بہ فرض زمیں را بہ آسماں
حاشا کہ زیں فشار بر ابرو خم افگنم

دعوتِ عزیمت

انسان کو ہمیشہ اولوالعزمی سے کام لینا چاہیے۔ اگر اس سلسلے میں دار و رسن کی منزل بھی پیش آ جائے تو قدم پیچھے نہ ہٹانا چاہیے۔ میرزا فرماتے ہیں:

آخر کار نہ پیداست کہ درتن فسرد
کف خونے کہ بداں زینت دارے ندہی

یعنی کیا یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا نہیں کہ خونِ حیات کے جس چلو کو تو آج سولی کی زینت بنانے کے لئے تیار نہیں، وہ بہرحال کسی نہ کسی وقت تیرے بدن میں افسردہ ہو کر رہ جائے گا۔ کیونکہ موت ٹل نہیں سکتی، اور اس میں دورانِ خون ختم ہو جاتا ہے۔

میرزا کی نظروں میں غم کو خاص قدر و قیمت حاصل تھی۔ خواہ آپ اسے غمِ عشق قرار دے لیں یا غمِ انسانیت۔ غم کی جو کیفیت انہوں نے مختلف مقامات پر بیان کی ہے اس سے بظاہر غمِ انسانیت ہی مُراد ہے۔ وہ ایک غزل کے مطلع میں کہتے ہیں۔

غم چو ہیہم در افگند ردکہ مراد ے دہد
دانہ ذخیرہ ے کند کاہ بہ بادے دہد

فصل کاٹتے ہیں تو دو چیزیں ملی جُلی ہوتی ہیں۔ ایک غلّہ دُوسرا بھوسا۔ غلّہ انسان کھاتے ہیں، بھوسہ جانوروں کو کھلایا جاتا ہے۔ میرزا فرماتے ہیں کہ غم ایسی چیز ہے جو انسان کی تمام خامیاں اس طرح الگ کر دیتا ہے جس طرح بھوسا غلّے سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور انسان میں جو اچھائیاں ہیں وُہ محفوظ ہو جاتی ہیں۔

یہی غم ہے جس کے متعلق میرزا نے کہا تھا:

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

میرزا کو ان لوگوں سے دلبستگی نہیں ہو سکتی جو اپنی آسودگی پر خوش ہوں، یعنی کس کے لئے ان کے دل میں کوئی دردمندی اور کوئی تڑپ نہ ہو۔ فرماتے ہیں:

حذر از زمہریر سینۂ آسودگاہی غالب
چہ منہا کہ بہ دل نیست جانِ ناشکیبا را

اے غالبؔ آسودہ دلوں سے دُور رہ۔ ان کے سینے زمہریر سے لبریز ہیں۔ جس کی فضا میں پہنچتے ہی ہر شے ٹھنڈی یخ ہو جاتی ہے۔ میرا دل درد سے خالی نہیں۔ اور تجھے کیا بتاؤں کہ میری بے قرار جان کے کتنے احسان میرے دل پر ہیں۔

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا، یہ میرزا کی انسان دوستی ہی کی کرشمہ فرمائیاں تھیں۔ اب انسان دوستی کی کچھ عملی مثالیں بھی ملاحظہ فرما لیجیے یا ایسی مثالیں جو آرزوؤں اور تمناؤں کے دشتِ ناپیدا کنار میں مصروفِ دورِ سیر رہتی تھیں۔

خواجہ حالیؔ فرماتے ہیں:

"اگرچہ میرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا، سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہو گئی تھی، اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا۔ مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔"

خواجہ حالیؔ ایک چشم دید واقعہ تحریر فرماتے ہیں:

"نواب لیفٹیننٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسبِ معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لیفٹیننٹ کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے مطابق انعام لینے کو آئے۔ میرزا کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا، اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آ گئی، تب ان کو انعام دے کر رُخصت کیا۔"

خواجہ حالیؔ ہی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دلّی کے عمائدین سے میرزا کے ایک دِلی دوست ملنے کے لئے آئے، جن کی حالت غدر میں سقیم ہو گئی تھی۔ اور وہ چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے تھے۔ میرزا نے کبھی انہیں مالیدے یا جامہ وار کا چُغہ پہنے بغیر نہیں دیکھا تھا۔ ان کے بدن پر چھینٹ کا فرغل دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوئی۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لئے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ انہوں نے کہا: "یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔" میرزا نے کہا: جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے چھین کر پہن لوں، مگر جاڑا شدت سے بڑھ رہا ہے، آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟ پھر ادھر اُدھر دیکھ کر کھونٹے سے اپنا مالیدے کا نیا چُغہ اُتار کر انہیں پہنا دیا اور اس خوبصورتی کے ساتھ وہ چُغہ ان کی نذر کیا۔"

یہ دوست مُفتی صدرالدّین آزردہ مرحوم و مغفور تھے۔ جن کی مدح میں میرزا کا ایک فارسی قصیدہ بھی موجود ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

صدرِ دین و دولت و صدر الصدورِ روزگار
میر و مخدوم و مطاع و والی و مولائے من

خاک کویش خود پسند افتادہ در جذبِ سجود
سجدہ از بہرِ حرم نگذاشت در سیمائے من

مشتری با من بہ پورسش کای بہ مُفتی ہم نشیں
بگزاری از نظر قرطاسِ استفتائے من

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم کے بعد میرزا کی آمدنی کے تمام دروازے بند ہو گئے تھے اور وہ اپنے کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کر رہے تھے۔ لیکن اس دَور میں ان کے ہاں کھانا کھانے والے کم و بیش بیس افراد تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ملازمین تھے، ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ ان میں ایک میاں گھمن بھی تھے جو ہنگامے سے پیشتر ملازمت چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیکن جب گزارا نہ ہو سکا تو بال بچوں سمیت آ گئے اور میرزا نے انہیں قبول کر لیا۔

واجد علی شاہ کے ایک قصیدے میں فرماتے ہیں:

گدائے ترک نژادم ز دودۂ سلجوق
فراخ تا نہ نہم خواں زنے خورم ناں را

(باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

لے اس شعر میں استفسار کو اکثر لوگ چھاپے کی غلطی کی بنا پر شعر بے معنی ہو گیا۔

انقلابی طریقِ جنگ کیا ہے؟

نامور انقلابی مصنف ڈاکٹر اقبال احمد، جنہیں حال ہی میں امریکہ میں ایک سازش کے تحت گرفتار کیا گیا ہے، اس مضمون میں الجزائر کی تحریکِ آزادی کے حوالے سے انقلابی جنگ کی حکمتِ عملی بیان کرتے ہیں۔

۱۹۶۱ء تک گوریلاؤں کی طاقت کم ہوتے ہوتے محض ۵ ہزار رہ گئی تھی اور ان کی اس اہمیت میں نمایاں کمی آگئی تھی کہ جب تک چاہتے فرانس کی فوجوں کو جھڑپوں میں الجھائے رکھتے لیکن ہوا یہ کہ فرانس نے جو علاقے فتح کئے تھے، ان میں حکومت نہ کر سکا کیونکہ اسے ایک ایسی آبادی سے واسطہ پڑا تھا جو کسی طرح تعاون پر آمادہ نہ تھی۔ قومی آزادی کے محاذ کو میدانِ جنگ میں تو شکست ہو گئی لیکن اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہی، جس کے تحت عام لوگ فرانس کے قبضے کو ناجائز سمجھتے رہے اور اس کے نظم و نسق سے عدمِ تعاون کرتے رہے۔

سوال یہ ہے کہ الجزائر کے کسانوں نے تشدد اور آلام کے سات سال تک اپنی زندگیاں، اپنی عورتوں کی عصمت اور اپنی حقیر پونجی کس لئے خطرے میں ڈالے رکھی؟ فرانس کے تسلط کے خلاف ان کے اس خوفناک اور خون ریز ردِ عمل کا جواز، محض ان کی قوم پرستی میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ ہند چینی کے سوا دوسرے کسی ملک میں آزادی کی تحریک نے خون ریزی کی یہ صورت اختیار نہیں کی تھی، اور پھر یہ بھی سوال ہے کہ سرفروشوں نے جب اس سے پہلے ہتھیار اٹھانے کا نعرہ لگایا تھا۔ کسانوں نے اس وقت لبیک کیوں نہیں کہا؟۔ اس کا جواب الجزائر کے ایک سرکردہ انقلابی نے دیا ہے۔ انہوں نے کہا "موزوں وقت" ابھی نہیں آیا تھا، اس طرح کے واقعات تو اس وقت رونما ہوتے ہیں، جب غیر ملکی حکومت کے خلاف یہ بھی پیدا ہوتی ہے جب شدید شکایتیں سر اٹھاتی ہیں اور ان کے ازالے اور عوام کے اطمینان کے لئے مروجہ ادارے غیر موثر ثابت ہوتے ہیں۔"

اس سے پہلے کے زمانے میں جب قحط پڑے اور حکومت نے بھاری ٹیکس لگائے تو کسانوں نے اس وقت بھی بغاوت کی تھی، لیکن مایوس کن سماجی اور اقتصادی حالات کے جواب میں غم و غصے کے یہ مظاہرے، جو بے ساختہ انداز میں اور وقفوں کے ساتھ رونما ہوتے ہیں۔ گوریلا، انقلاب کے لئے کافی نہیں ہوتے" انقلابی جنگ کا مطالبہ محض اس قدر نہیں کہ عوام میں حکومت کے خلاف بے اطمینانی پائی جاتی ہو بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام تنگ آمد بجنگ آمد کی مصداق ظلم اور تحقیر کے خاتمے کی خاطر سینہ سپر ہو کر نکل آئیں، اس کے لئے سالہا سال تک درد و کرب برداشت کرنے کا حوصلہ اور چپ چاپ خفیہ کارروائی کرنے اور پورے جوش اور جذبے سے ابھرنے کا پختہ ارادہ موجود ہونا چاہیئے۔"

دشمن کی اخلاقی شکست

اگر کوئی قوم یہ محسوس کرنے لگے کہ اخلاقی طور پر اب اپنے حاکموں سے اس کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے تو وہ انقلابی کارروائی کے لئے پختہ ارادے کے ساتھ اٹھ سکتی ہے۔" انقلابی جنگ کی کامیابی کے لئے شرط یہ ہے کہ دشمن کو اخلاقی طور پر کاٹ کر الگ کر دینے کا عمل مسلسل جاری رہے اور اس کے نتائج شدت اختیار کرتے جائیں، جب یہ عمل تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو جنگ جیت لی جاتی ہے، کیونکہ قوم اس وقت تک لڑنے کا تہیہ کر چکی ہوتی ہے جب تک اس کا ایک فرد بھی زندہ ہے۔"

اس کے بعد الجزائر کے دوسرے رہنماؤں نے بھی مجھے یہ بتایا کہ ہمیں فرانس کی فوجوں سے زیادہ فرانس کے وعدوں کا توڑ کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑی۔ جو برابر یہ کہہ رہے تھے کہ ہم بالآخر آزادی دے دیں گے۔ اور اصلاحات نافذ کر دیں گے۔ بعد میں فرانس نے جب اپنی فوجی کارروائی تیز کیں تو الجزائر کے عوام رفتہ رفتہ اس سے کٹ کر الگ ہوتے گئے۔ کیونکہ انقلابی جنگ میں فوجی کارروائی کے معنی ہوتے ہیں۔ شہری آبادی کا وسیع پیمانے پر قتلِ عام (اگر کچھ نہیں تو محض اس بنا پر کہ کسانوں اور گوریلاؤں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا) چنانچہ قومی محاذِ آزادی کے رہنماؤں کو اور بھی یقین ہو گیا کہ وہ فوجی جھڑپوں میں نہیں بلکہ انقلابی جنگ میں سرخرو ہو کر نکلیں گے۔ ایسے حالات، جن کے نتیجے میں انقلابی جنگ لڑی جاتی ہے، سازش سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ تیز رفتار سماجی تبدیلی سے جو الٹ پھیر کی کیفیت رونما ہوتی ہے۔ اور نئے مطالبات سر اٹھاتے ہیں انقلابی جنگ کے حالات، انہی میں پیوست ہوتے ہیں۔ اور جب حاکمانِ وقت، جدید تبدیلیوں کا چیلنج قبول کرنے میں ناکام رہتے ہیں، تو انقلابی جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ماضی کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی رشتوں میں تبدیلی کی طلب بڑھتے بڑھتے اس مرحلے تک پہنچ جاتی ہے جہاں ان لوگوں کے ساتھ تصادم لازمی ہو جاتا ہے جن کے مفادات کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ حالات جوں کے توں برقرار رکھے جائیں۔ ان ممالک اور نو آبادیات میں جہاں کے حکمران اپنے اقتدار اور مفادات کی اجارہ داری سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جہاں واقعی اصلاحات نافذ ہوتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اختیارات اور فرائض میں شراکت باہمی کے نئے ادارے قائم ہونے لگتے ہیں ان میں تبدیلیوں کا عمل نظم و ضبط کے ساتھ جمہوری انداز میں رونما ہوتا ہے۔ (اگرچہ تمام تر پُرامن نہیں ہوتا) لیکن جب کوئی حکمران طبقہ، اصلاحات کو روکنے کی سعی کرتا ہے۔ (جس کے معنی لامحالہ یہی ہوتے ہیں کہ اس کے اقتدار اور مفادات میں کمی ہو جائے گی۔) تو نئی سیاسی طاقتوں کے ساتھ اس کے تصادم میں رفتہ رفتہ تشدد اور خونریزی کا عنصر شامل ہوتا جاتا ہے۔

ایک ایسی حکومت، جو عوامی امنگوں کی تکمیل پر آمادہ نہیں ہوتی، بالآخر اپنے وجود کا جواز کھونے لگتی ہے۔ انقلابی طاقتیں اپنی تدبیروں سے اس عمل میں تیزی پیدا کرتی ہیں اور اس کے لئے حاکموں کی مرکزیت اور موثر اقتدار کو کمزور کر دیتی ہیں اور انقلاب کی بکھری ہوئی چنگاریوں کو اکٹھا کر کے انہیں ایک دہکتا ہوا الاؤ بنا دیتی ہیں۔ ایسے متلون حالات میں جب کہ قیادت کے لئے مقابلے کی صورت اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ غیر کمیونسٹ انقلابی گروہوں کو بہت سے عناصر کی بنا پر رکاوٹیں درپیش ہوتی ہیں۔ جن میں سب سے اہم عنصر مغربی طاقتوں کا رویہ اور ان کی پالیسیاں ہوا کرتی ہیں۔ پرانے نظام کے محافظوں کی حمایت کر کے امریکہ جیسی عظیم قوم، جمہوری طاقتوں کی جنگی قوت کو ضعف پہنچاتی ہے اور سرد جنگ میں غیر جانب دار رہنے والوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ کمیونسٹوں سے امداد طلب کریں، اس طرح وہ کمیونسٹوں کی صف میں نئے غازیوں اور نئے شہیدوں کا اضافہ کرتی ہے۔

جب گوریلا کارروائی شروع ہوتی ہے

انقلابی تحریک، جب ایک بار گوریلا کارروائی کے مرحلے میں داخل ہو جائے تو اس کا مرکزی مقصد یہ قرار پاتا ہے کہ دشمن کی اخلاقی بے بضاعتی کو یقین کے درجے پر پہنچا دیا جائے اور اقتدار کے متوازی ادارے قائم کر کے، اس مردود نا[illegible]دو، حکومت کا متبادل عوام کے روبرو پیش کر دیا جائے۔ تحریک کا اصل کام یہ نہیں ہوتا کہ دشمن کو لڑائی میں ہرا دیا جائے، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اسے نظم و نسق سے بے دخل کر کے، نظم و نسق کا متبادل انتظام کیا جائے۔ اس کوشش کا اصل مرکز دیہات ہوتا ہے جہاں آبادی کی اکثریت آباد ہوتی ہے۔ اور جہاں حکومت کا وجود محض استحصال کی حد تک محسوس کیا جاتا ہے۔ یہاں عوام اور حکومت کے درمیان رابطے کا ذریعہ دیہات کا سرپنچ اور اس

جامعہ کراچی میں ایک یادگار دن

نعیم آروی

جب وائس چانسلر کی برطرفی کی تائید میں ۲۴۳ مضبوط ہاتھ فضا میں لہرا رہے تھے

ڈاکٹر قریشی کا چپراسی کانفرنس ہال میں اُن کا بیان تقسیم نہ کر سکا

۱۴ فروری کو کراچی یونیورسٹی بند تھی۔ کلاسیں خالی تھیں، لمبے لمبے کاریڈور اور لان سنسان پڑے تھے۔ ہوا سے سرسراتے ہوئے سیاہ گون اور ہنستے مسکراتے ہشاش بشاش چہرے غائب تھے جن سے کلاسیں، بحث مباحثہ اور بذلہ سنجی کی محفلیں سجتی اور سنورتی ہیں۔ پوری یونیورسٹی گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی، البتہ شعبۂ فنون کے ہال میں زندگی کے آثار تھے۔

ٹھیک گیارہ بجے کراچی یونیورسٹی ٹیچرز سوسائٹی کا ایک غیر معمولی اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اساتذہ کی بڑی تعداد ہال میں موجود تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس سے قبل سوسائٹی کے ارکان اتنی بڑی تعداد میں کبھی حاضر نہ ہوئے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ اساتذہ کی حاضری اور ان کی دلچسپی سے اس غیر معمولی اجلاس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اجلاس میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر مسٹر اشتیاق حسین قریشی کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہونے والی تھی، انجمن اساتذہ کراچی یونیورسٹی نے ان پر الزام عائد کیا تھا کہ

"وائس چانسلر اور سنڈیکیٹ نے اساتذہ کے جائز مطالبات حکومت سے منظور کرانے میں نااہلی کا ثبوت دیا ہے، اور وائس چانسلر اور سنڈیکیٹ نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اساتذہ کے اعتماد کو مجروح کیا ہے، لہٰذا وائس چانسلر ۱۵ یوم کے اندر اندر اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں۔"

یہ وائس چانسلر کی وعدہ خلافی کی دستاویز ہے

انجمن اساتذہ کراچی یونیورسٹی نے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی پر الزام عاید کیا ہے کہ انہوں نے ۱۱ جنوری ۱۹۷۱ء اور ۲۵ جنوری ۱۹۷۱ء کو انجمن اساتذہ کراچی یونیورسٹی کے نمائندوں اور ان کے درمیان ہونے والے مذاکرات میں جو تحریری وعدہ کیا تھا، اس سے وہ منحرف ہو گئے اور تحریری معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اساتذہ کے اعتماد کو مجروح کیا ہے، لہٰذا وہ ۱۵ یوم کے اندر اندر اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں۔ وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے مذکورہ بالا اجلاس میں تحریری وعدہ کیا تھا کہ:۔

الف۔ یونیورسٹی آرڈیننس پر نظر ثانی کی جا رہی ہے اور اس کی جگہ ایک نیا قابلِ قبول آرڈیننس بہت جلد نافذ کر دیا جائے گا۔

ب۔ یہ بات بھی طے ہو گئی تھی کہ سنڈیکیٹ اور حکومت سے لیکچرر کے لئے سنگل گریڈ ۴۵۰-۵۰-۱۵۰۰، ای بی ۵۰-۱۲۵۰ کی سفارش کی جائے گی اور جس کی کارگزاری کا معیار آنرز اور پوسٹ گریجویٹ اور تحقیقی کاموں کا تین سالہ تدریسی تجربہ ہوگا۔

ج۔ اس بات پر بھی اتفاق ہو گیا تھا کہ مددگار پروفیسروں کا جو منظور شدہ معیار ہوگا۔ وہی معیار موجودہ لیکچراروں کے لئے بھی ہوگا۔ مددگار پروفیسروں کی خالی آسامیوں کو موجودہ آرڈیننس اور قوانین کے مطابق درخواست گزار لیکچراروں کو ترقی دے کر پُر کیا جائے گا۔

د۔ اگر ٹیچرز سوسائٹی کو یہ شرائط قابلِ قبول ہوں تو وہ اسٹرائیک نوٹس واپس لے لے، سنڈیکیٹ معاملات کو طے کرانے کے لئے جلد از جلد اقدام کرے گی۔

---

۱۱ جنوری ۱۹۷۱ء اور ۲۵ جنوری ۱۹۷۱ء کو وائس چانسلر اور ٹیچرز سوسائٹی کے ارکان کے درمیان ہونے والے معاہدے پر وائس چانسلر اشتیاق حسین قریشی، محمد افضال قادری، ایم عتیق اللہ، ایچ ایم قاضی، محمد یوسف کے دستخط ہیں۔ اور مذاکرات میں انہی حضرات نے حصہ لیا۔ انجمن اساتذہ کراچی یونیورسٹی نے وائس چانسلر پر مذکورہ بالا تاریخوں میں ہونے والے مذاکرات میں طے شدہ شرائط کی خلاف ورزی کا الزام عائد کرتے ہوئے ان سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا ہے۔

اجلاس شروع ہوتا ہے

ٹھیک گیارہ بجے اساتذہ کا ہنگامی اجلاس شروع ہو گیا، کرسیٔ صدارت پر ڈاکٹر افضال حسین قادری براجمان تھے۔ اساتذہ نے اپنے پیشے کا وقار مدنظر رکھتے ہوئے ایک انتہائی شائستہ طریقہ اختیار کیا تھا، آج ان کے دل سے ہر خوف نکل چکا تھا، وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے سینہ سپر تھے۔ جلسے کے دوران میں ایک چپراسی نے ڈاکٹر اشتیاق حسین کا ایک سائیکلو اسٹائل بیان تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اساتذہ نے اس بات پر اعتراض کیا، لہٰذا چپراسی کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔

چند لمحوں کے بعد اچانک وائس چانسلر کا ایک ایلچی اسی چپراسی کے ساتھ ہال میں داخل ہوا۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ کون منع کرتا ہے۔ بانٹو۔"

اساتذہ کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی، چپراسی وائس چانسلر کا سائیکلو اسٹائل بیان تقسیم کرتا جاتا تھا اور اساتذہ اس بیان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پیروں سے مسل رہے تھے۔ وائس چانسلر کے ایلچی نے جب اساتذہ کے یہ تیور دیکھے تو اس جگہ سے

کے مشیر ہوتے ہیں۔ اس رابطے کو توڑنے کے لئے محتاط منصوبہ بندی، تنظیم اور سخت محنت درکار ہے۔ دیہات سے حکومت کا خاتمہ ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق بتدریج کیا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے دیہی حکام کو یا تو اپنے ساتھ ملا لیا جاتا ہے، ورنہ ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تحریک کے سیاسی ارکان نئے عہدیدار مقرر کرتے ہیں یا سابقہ عہدیداروں سے اپنی ماتحتی میں کام لیتے ہیں۔ سرفروش باغیوں کو اس مرحلے میں فوری کام یہ درپیش ہوتا ہے کہ ایک انتظامی ڈھانچہ قائم کریں تاکہ وہ ٹیکس اکٹھا کرے۔ کچھ تعلیم اور سماجی بہبود کے سامان بہم پہنچائیں اور اقتصادی سرگرمیاں بحال رکھیں۔ ایک ایسی انقلابی گوریلا تحریک جو آبادی کی ان ضرورتوں سے لاتعلق رہتی ہے اور ایسے انتظامی ڈھانچے نہیں بناتی، رفتہ رفتہ اپنے منصب سے گر کر ڈکیتوں کا ایک گروہ بن کر رہ جاتی ہے

(باقی آئندہ)

کھسک جانے ہیں ہی عافیت سمجھی۔

چند منٹوں کے تعطل کے بعد اجلاس کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔ ڈاکٹر افضال حسین قادری نے وائس چانسلر کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کرتے ہوئے اس اہم مسئلے پر غور کرنے کے لئے پندرہ منٹ کا وقفہ دے دیا۔ انہوں نے کہا "مسئلہ نہایت اہم ہے، ممکن ہے آپ لوگ آپس میں کچھ مشورہ کرنا چاہیں۔"

وقفہ کے اعلان کے باوجود اساتذہ لابی کے لئے باہر نہیں گئے اور اپنی نشستوں پر بیٹھے رہے۔ کسی نے کہا "جناب ہم اس اہم مسئلے پر گیارہ سال سے غور و فکر کرتے آئے ہیں، بہت سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔"

دوبارہ اجلاس شروع ہوتے ہی وائس چانسلر کے منظورِ نظر شریف المجاہد صدر شعبۂ صحافت نے اجلاس کی کارروائی میں تعطل پیدا کرنے کے لئے عذر پیش کیا کہ "قرارداد اہم ہے، اساتذہ اتنی جلدی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے، پہلے اس قرارداد کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں اساتذہ میں تقسیم کرائی جائیں۔"

کسی نے کہا "اگر آپ حکم دیں تو اس قرارداد کو اتنی بار پڑھا جائے کہ اس کا ایک ایک نقطہ آپ کو ازبر ہو جائے۔"

اس پر ایک دوسرے استاد نے مزید جملے جوڑ دیئے۔ "مجاہد صاحب اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے، بس ایک جملہ ہے، وائس چانسلر صاحب پندرہ دن کے اندر اندر مستعفی ہو جائیں" اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟"

انجمن اساتذہ کراچی یونیورسٹی کی طرف سے جو قرارداد پیش کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ سوسائٹی ۱۹۶۹ء سے یونیورسٹی کی خود مختاری، جمہوری آزادی، یونیورسٹی کی پالیسی اور انتظامی امور میں اساتذہ کے منتخب نمائندوں کی شمولیت، نئی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں کیڈرز اور پے اسکیل پر نظر ثانی کے لئے مسلسل اور صبر آزما جد و جہد کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں متعلقہ حکام سے بار بار رابطہ قائم کیا گیا جس کا کوئی مثبت حل برآمد نہ ہو سکا۔ اساتذہ نے بحالتِ مجبوری ۱۵ جنوری ۱۹۷۱ء سے غیر معینہ مدت کے لئے ہڑتال پر جانے کا فیصلہ۔ اسی دوران میں حکومت نے ہڑتال کے نوٹس کے جواب میں اعلان کیا کہ ایک نیا یونیورسٹی آرڈیننس زیرِ غور ہے۔ اور جس کا اعلان جلد سے جلد کر دیا جائے گا۔ دریں اثنا وائس چانسلر نے بھی افہام و تفہیم کے لئے اساتذہ کو مدعو کیا اور اساتذہ کے تمام مطالبات کو سنڈیکیٹ اور حکومت سے منظور کرانے کا وعدہ کیا۔ انجمن اساتذہ کراچی یونیورسٹی نے معاملات کو پرامن طور پر نمٹانے کے لئے حکومت کی یقین دہانی اور وائس چانسلر کے تحریری معاہدے پر اعتماد کیا اور ہڑتال نوٹس کو منسوخ کر دیا۔

قرارداد میں کہا گیا ہے کہ قابلِ افسوس امر ہے کہ سنڈیکیٹ نے معاہدے میں شامل قرارداد کو قبول نہیں کیا اور نہ وائس چانسلر نے معاہدے کی قرارداد کو حکومت اور سنڈیکیٹ سے منظور کرانے کا وعدہ ایفا کیا۔ یہی نہیں بلکہ سنڈیکیٹ نے اس معاہدے کو یونیورسٹی اساتذہ کی "تجویز" کا نام دے کر اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی اور اس معاہدے کو اپنی طرف سے کوئی رائے دیئے بغیر چانسلر کو روانہ کر دیا۔ یکم فروری ۱۹۷۱ء کو سوسائٹی اور وائس چانسلر کے درمیان آخری میٹنگ ہوئی جس میں اساتذہ کے وفد کو آگاہ کیا گیا کہ حکومت نے معاہدے کو نامنظور کر دیا۔ قرارداد میں مزید کہا گیا کہ چونکہ وائس چانسلر نے اساتذہ سے کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ معاہدے کو سنڈیکیٹ اور حکومت سے منظور کرانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں لہٰذا اساتذہ ان سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ پندرہ یوم کے اندر اندر مستعفی ہو جائیں۔"

قرارداد پیش کرنے کے بعد سوسائٹی کے ارکان کو اس پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ یونیورسٹی کے شعبۂ تادیب کے سربراہ میجر آفتاب حسن تیار بیٹھے تھے، فوراً ڈائس پر پہنچ گئے اور کہا کہ مجھے اس قرارداد پر بڑی حیرت ہوئی، اساتذہ اس حد تک پہنچ جائیں گے، اس کا مجھے گمان تک نہ تھا۔ فرض کیجئے کہ اگر وائس چانسلر نے مستعفی ہونے کا مطالبہ تسلیم نہ کیا تو پھر آپ کیا کریں گے؟

میجر صاحب نے قرارداد پر دوسرا اعتراض یہ کیا کہ چونکہ قرارداد غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، اس لئے اس کی کاپیاں تمام اساتذہ میں تقسیم کرائی جائیں اور اس پر غور کرنے کی مہلت دی جائے۔ واضح رہے کہ اس ہنگامی اجلاس میں ارکان کی تعداد گذشتہ اجلاسوں سے بہت زیادہ تھی اور چھٹی کے باوجود شہر سے اساتذہ کی اچھی خاصی تعداد شرکت کے لئے آئی تھی۔

میجر صاحب کے اس اعتراض پر کسی نے چپکے سے کہا۔ "جی ہاں، ضرور مہلت دی جائے تاکہ آپ "INTRIGUE" کر سکیں۔"

وائس چانسلر کے ایک اور بہی خواہ ڈاکٹر احسان رشید صدر شعبہ معاشیات، میجر آفتاب حسین کے موقف کی تائید کرتے ہوئے ڈائس سے گذر گئے۔

ڈاکٹر سید علی اشرف نے قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے وائس چانسلر کے اگلے پچھلے سارے احسانات چکا دیئے، انہوں نے کہا "وائس چانسلر پر معاہدے کی خلاف ورزی عائد نہیں ہوتی انہوں نے سنڈیکیٹ کے سامنے آپ کی قرارداد پیش کی تھی۔ لہٰذا ان سے مستعفی ہونے کا مطالبہ غلط ہے۔"

ان کے جواب میں کہا گیا وائس چانسلر اور سنڈیکیٹ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ وائس چانسلر اپنے مطلب کی باتیں سنڈیکیٹ سے منظور کروا لیتے ہیں، چند سال بیشتر ان کے کہنے پر سنڈیکیٹ نے ایک استاد کو فوری طور پر برطرف کر دیا اور جب وائس چانسلر نے دیکھا کہ اس استاد کی برطرفی سے حالات سنگین ہو جائیں گے تو سنڈیکیٹ کی ایک ہنگامی میٹنگ بلوا کر اس استاد کو دوبارہ ملازمت پر بحال کرا دیا۔ جہاں تک اساتذہ کے مطالبات کا تعلق ہے، اگر وائس چانسلر چاہتے تو سنڈیکیٹ اس پر اپنی منظوری دے دیتی، مگر اس معاملے میں وائس چانسلر کی نیت نیک نہیں ہے۔"

قرارداد پر جب بحث فیصلہ کن موڑ پر پہنچنے لگی تو میجر آفتاب حسن قدرے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں بولے۔ "ارے بھائی طے تو کر لینے دو کہ ہم اس قرارداد پر کیا رائے قائم کریں۔"

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اساتذہ نے زوردار آواز میں کہا۔ جناب ہم طے کر چکے ہیں۔"

میجر صاحب مسکرائے۔ "میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کیا طے کر کے آئے ہو۔"

کسی استاد نے کہا "جناب ہمیں بھی معلوم ہے کہ آپ کیا طے کر کے آئے ہیں۔"

اس غیر معمول اور ہنگامی اجلاس میں ایک اور نئی بات دیکھنے میں آئی کہ کچھ اساتذہ جن کے بارے پورے وثوق سے کہا جاتا تھا کہ وہ "وی سی" کیمپ کے آدمی ہیں، وہ قرارداد کی حمایت میں فن خطابت کا سارا زور صرف کر رہے تھے۔ ڈاکٹر منظور الدین احمد ریڈر شعبہ سیاسیات نے قرارداد کے حق میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وائس چانسلر نے جہاں اساتذہ کا اعتماد کھو دیا ہے وہاں حکومت سے معاہدے کی منظوری حاصل نہ کر کے حکومت کا بھی اعتماد کھو دیا ہے۔ انہیں فوری طور پر مستعفی ہو جانا چاہئے۔"

قرارداد میں ایک ترمیم پیش کی گئی، قرارداد میں وائس چانسلر سے صرف مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جب کہ ترمیم یہ کرائی گئی کہ وائس چانسلر پندرہ یوم کے اندر اندر مستعفی ہو جائیں۔ اب قرارداد منظوری کے آخری تاریخی مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔

میجر صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں کہا "میں اب بھی کہتا ہوں کہ قرارداد اہم ہے۔ اسے اساتذہ میں سرکولیٹ کیا جائے۔"

ایک استاد نے مؤدبانہ گذارش کی "جناب سرکولیٹ کرانے سے مزید بھد اڑے گی۔"

آخر میں قرارداد کے حق میں ووٹ لئے گئے۔ ۱۴۳ اساتذہ کے مضبوط ہاتھ فضا میں لہرا رہے تھے۔ مخالفت میں صرف ۱۴ تھکے تھکے، مضمحل ہاتھ اٹھے، اور فوراً گر گئے۔

ڈاکٹر معصوم علی ترمذی جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ وائس چانسلر کے دست راست ہیں، حق و باطل کے اس پرامن معرکہ سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھا، قرارداد کی مخالفت کرنیوالوں میں پروفیسر ریاض السلام، مسٹر نعیم الرحمٰن، پروفیسر ایس ایم چودھری پروفیسر اتفاق علی اور چند دوسرے اساتذہ شامل تھے۔

قرارداد بالآخر اکثریت کے فیصلے کے مطابق منظور کر لی گئی، یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا حیرت انگیز اور معرکۃ الآرا واقعہ ہے، جب کہ اساتذہ نے مجبور ہو کر کسی وائس چانسلر سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا ہو۔ قرارداد منظور ہو گئی۔ یونیورسٹی کے اساتذہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اب دیکھنا ہے کہ یونیورسٹی کے چھوٹے ایوب خاں اساتذہ کے اس فیصلے کے سامنے کب تک ٹھہرتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں بائیں بازو کی تحریک

جناب عبدالحمید نے مشرقی بنگال میں بائیں بازو کی تحریک کے موضوع پر اپنے مضمون کی گذشتہ قسط میں تین خاص گروپوں کی نشاندہی کی تھی (۱) گناشکتی گروپ (۲) پیپنہ گروپ (۳) ظفرمینن گروپ - اس مضمون گناشکتی گروپ اور دائیں بازو کے مارکسٹوں کی حکمت عملی سے بحث کی گئی ہے۔

گناشکتی گروپ مسلّح انقلاب چاہتا ہے!

اگر نیپ ولی گروپ عوامی لیگ میں شامل ہو جاتا!

ان تینوں گروپوں میں گناشکتی گروپ سب سے زیادہ منظم اور واضح ہے اور یہ ایک ہی گروپ ہے جس نے معقول طور پر ایک بسیط اور دیرپا موقف کی ترجمانی کی ہے۔ حقائق کا تقاضہ یہ ہے کہ اس گروپ کے بارے میں نسبتاً زیادہ مکمّل طور پر بحث کی جائے۔ ان کا مقصد مسلّح جدوجہد کے ذریعے ایک نیا جمہوری انقلاب لانا ہے۔ یہ جدوجہد ایک متّحدہ محاذ انجام دے گا جس کی قیادت کسان اور مزدور کریں گے۔ (اس میں کسانوں کے کردار پر زیادہ زور دیا گیا ہے، اس لئے کہ نہ بلحاظ تعداد، یہ بھاری اکثریت میں ہیں' اور شہری صنعتی علاقے میں مسلّح جدوجہد حکمت عملی کے اعتبار سے غیر ممکن ہے، متّحدہ محاذ کی اس جدوجہد میں نسبتاً کمتر کردار محبِ وطن بورژوازی اور درمیانہ طبقے کی شمولیت سے پورا ہوگا۔ گناشکتی گروپ کے لوگ بورژوازیوں کے سیاسی اداروں میں مثلاً پارلیمنٹوں کے انتخابات میں شمولیت کے قائل نہیں کیونکہ ان ذرائع سے سیاسی اقتدار کا حصول غیر ممکن ہوتا ہے اور پارٹی کے لئے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ مبتذل ہوکر خود بھی چھوٹے بورژوازی طبقے کی ایک پارٹی بن جائے۔ یہ لوگ طبقاتی تنظیموں کے ذریعے کام کو بھی مسترد کر چکے ہیں، ایسی تنظیمیں آخر کار "معیشت پسندی" کو اپنا بڑا مقصد بنا لیتی ہیں اور اس سے انقلاب کے مقصد کو تقویت نہیں ملتی۔ ٹریڈ یونینیں، اجرتوں کے مطالبوں کو اپنا اہم ترین وظیفہ بنا لیتی ہیں اور کرشک سمیتی کے تجربے سے ظاہر ہے کہ کسانوں کی تنظیمیں ایسے مطالبات آگے بڑھاتی ہیں' جن سے اراضی کے مالک متوسط درجے کے کسانوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لہذا، وہ اکیلی تنظیم جسے مضبوط بنانے کی ضرورت ہے، مارکسسٹ پارٹی ہے اور مسلّح انقلاب اس کا منتہائے مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھاشانی گروپ سے الگ ہونے کے بعد انھوں نے ایک نئی "عوامی پارٹی" نہیں بنائی اور جن طبقاتی تنظیموں میں یہ لوگ سرکردہ منصب پر کام کر رہے تھے، ان میں دھڑے بندی کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

انقلاب کی حکمت عملی یہ ہے کہ دیہات میں گوریلا گروپ بنائے جائیں جو انقلابی طبقاتی جدوجہد کو تیز کریں اور ان کا آخری مقصود یہ ہو کہ اس نوع کی سرگرمیوں کو، جو ملک بھر میں جاری ہوں، باہم مربوط کریں اور ان میں شدّت پیدا کریں' تاکہ بالآخر ریاست کا اقتدار اپنے قبضے میں لیا جا سکے۔ البتہ اصل جدوجہد کی حکمتِ عملی کو جہاں تک اچھّی طرح سمجھنے اور سمجھانے کا تعلّق ہے۔ یہ گروپ اس بارے میں پوری طرح واضح نہیں۔ اس کا ایک عُذر غالباً یہ ہوسکتا ہے کہ ایسی کوئی حقیقی کارروائی کبھی ہوئی نہیں، یہ وہ خیالات ہیں، جس کے بارے میں "منصوبے" کے طور پر محض گفتگو ہوتی رہی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ بہت سے سوالات کو آئندہ کبھی حل کرنے کے لئے التوا میں ڈال دیا گیا ہے کہ عملی کارروائی کے دوران میں جوں جوں پیدا ہوں گے' ان پر فیصلے کی صورت نکلتی آئے گی، مثلاً" یہ سوالات کہ دیہی علاقوں میں طبقاتی جدوجہد کی نوعیت اور ہیئت کیا ہوگی، حلیفوں اور طبقاتی دشمنوں کی واضح نشان دہی اور شناخت، حکومت کی زبردست اور تازہ فوجی طاقت کی طرف سے بھرپور حملے کے مقابلے میں مناسب قوّت کا مظاہرہ اور پھر اپنے تحفّظ اور بقا کے بارے میں صریح یقین دہانی۔ بظاہر ان لوگوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ اس طرح کے سوالات کا ایک محتاط تجزیہ کرنے سے، پوری حکمتِ عملی کے قابل عمل ہونے کے امکان پر روشنی پڑتی ہے۔ تاہم اس حکمتِ عملی کے قابل عمل ہونے کے سوال پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔

دائیں بازو کے مارکسسٹ

یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ مختلف گروپوں کے درجہ دار منصب اور ان کی حیثیت کا تعیّن ہمارا مقصود نہیں۔ یہ اصول بین الاقوامی سطح پر کئی برسوں سے زیرِ بحث چلے آئے ہیں

گناشکتی گروپ، مسلّح انقلاب، اس کا مقصود ہے

اور اس مباحثے میں عام طور پر جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں' اُن میں اضافے کی بھی گنجائش نہیں یہاں جس بات کی کوشش کی گئی ہے' وہ یہ ہے کہ دو بڑے گروپوں' یعنی دائیں بازو کے مارکسٹوں اور گناشکتی گروپ کے اصولوں کے نظم و ترتیب اور عملی پروگرام کا تجزیہ کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ یہ کس حد تک قابلِ عمل ہیں اور خاص طور پر مشرقی بنگال کے موجودہ حالات ہیں؟ تو آئیے سب سے پہلے دائیں بازو کے مارکسٹوں کے موقّف کا جائزہ لیتے ہیں:-

بائیں گروپوں میں، دائیں بازو کے مارکسٹوں نے سب سے پہلے اس غلط پالیسی کو محسوس کر لیا تھا، جو عوامی لیگ کے زیرِ قیادت، زبردست قومی اُبال کی مخالفت پر مبنی تھی، چنانچہ اب انھوں نے مشرقی بنگال کی خود مختاری اور مغربی پاکستان کے اقلیّتی علاقوں کی خود مختاری کی حمایت کی ہے، اگرچہ عوامی لیگ نے اپنے چھ نکات کے ذریعہ' قومی خود مختاری کے سوال کو جس تشدّد سے پیش کیا تھا' اس تیزی و تندی کے ساتھ انھوں نے اپنا خود مختاری کا پروانہ پیش نہیں کیا۔ یہ مارکسسٹ' چونکہ ایک کُل پاکستان پارٹی میں شامل ہیں اور ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں، اس لئے مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں کے خلاف مشرقی پاکستان کی جدوجہد کو وہ اب بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں، گویا سرمایہ داروں کے خلاف یہ ایک کُل پاکستان طبقاتی جدوجہد کا داخلی حصّہ ہے۔

دائیں بازو کے مارکسٹوں کا اصل مقصد ایک بورژوا جمہوری پارلیمانی نظام قائم کرنا ہے جس سے معاشرے کو بتدریج ایک سوشلسٹ نظام میں تبدیل کرنے کا کام آسان ہو جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر، یہ مختلف طبقات کا ایک متّحدہ محاذ قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں محبّ وطن سرمایہ داروں' متوسط طبقوں، کسانوں اور مزدوروں کی نمائندگی ہو۔ مزدور طبقہ چونکہ کمزور ہے' اس لئے، جاگیردار' اجارہ دار' سرمایہ دار' اور سامراجی حکمراں طبقوں کے خلاف اس اتّحاد میں بورژوازی ایک نمایاں کردار ادا کرے گا۔ ولی نیپ' وہ عوامی تنظیم' جس کے

ذریعے، یہ لوگ کام کر رہے ہیں، ان کے خیال میں مختلف طبقات پر مشتمل ایک ایسی ہی پارٹی ہے۔ عوامی لیگ چونکہ ایک ایسی پارٹی ہے جس کی قیادت محبِ وطن بورژوازی اور متوسط طبقے کے ہاتھ میں ہے اس لیے دائیں بازو کے مارکسسٹ عوامی لیگ اور ولی نیپ کے درمیان انتخابات میں متحدہ محاذ بنانا چاہتے تھے عوامی لیگ نے چونکہ اس اتحاد سے انکار کر دیا اور یہ مشورہ دیا کہ ولی نیپ سیدھی طرح عوامی لیگ میں ضم ہو جائے، اس لئے دائیں بازو کے مارکسسٹوں میں کسی قدر برہمی پیدا ہو گئی ہے۔ گذشتہ چند مہینوں سے عوامی لیگ پر ان لوگوں کی نکتہ چینی بڑھتی جا رہی ہے اور اس پر ایک ایسی حکومت کے قیام کے لئے ناپاک ہتھکنڈے استعمال کرنے کا الزام لگا رہے ہیں، جو بنگالی سرمایہ داری کی اندھا دھند ترقی کی راہ کھول دے گی۔ صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ ۱۹۶۹ء کے موسم گرما میں عوامی لیگ کا مستقل دُم چھلا بنے رہنے کے بعد، یہ جو اچانک تبدیلی رونما ہوئی ہے اور عوامی لیگ پر زبردست تنقید کی بوچھار ہو رہی ہے تو اس کا سبب وہی مایوسی ہے، جو انتخابات میں اتحاد سے انکار ہو جانے کی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔

نیپ اور عوامی لیگ میں فرق کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ جہاں تک قیادت کی طبقاتی ساخت، اس کے ارکان کی طبقاتی نوعیت اور پالیسیوں کا تعلق ہے ولی نیپ اور عوامی لیگ کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں پارٹیوں کو اپنی اپنی قیادت بنیادی طور پر شہر کے متوسط طبقے سے حاصل ہوئی ہے۔ دونوں کے قائدین کی صف میں، کچھ ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں اور تاجروں کی تعداد شامل ہے۔ ان کی بنیادی رکنیت کی تشکیل کس طرح ہوئی ہے۔ اس بارے میں ضروری اطلاعات کی عدم موجودگی میں کوئی تجزیہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن گمان یہی ہے کہ مزدور طبقہ میں رکنیت سازی اور دیہی عوام کے تعاون کے اعتبار سے عوامی لیگ کا حصّہ ولی نیپ سے نمایاں طور پر کم نہ ہوگا۔ دونوں پارٹیوں کے پروگرام ایک دوسرے سے بیحد ملتے جلتے ہیں۔ عوامی لیگ نے "سوشل ڈیماکریسی" کا وعدہ کیا ہے جس کی صراحت واضح طور پر اس کے حالیہ منشور میں ہو چکی ہے۔ اس نے خاصے وسیع پیمانے پر قومی ملکیتوں کی تشکیل کا پروگرام شروع کرنے کا وعدہ کیا ہے اور اس میں بینک، انشورنس، درآمدی تجارت اور خاص نوعیت کی بڑی بڑی صنعتیں قومی ملکیت میں لینے کا پروگرام شامل ہے۔ ایک تیسری غیر جانبدار دُنیا کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے، عوامی لیگ نے سہروردی کی خارجہ پالیسی سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہے۔ بیرونی استحصال کے خلاف اس نے جو موقف اختیار کیا ہے، اس سے اس کی انتہا پسندانہ قوم پرستی میں شدّت پیدا ہوئی ہے۔

لہٰذا، صاف معلوم ہوتا ہے کہ عوامی لیگ بھی بڑی حد تک مختلف طبقات پر مشتمل ایک ایسی پارٹی ہے جو دائیں بازو کے مارکسسٹوں کے مقصود کے مطابق، بورژوا جمہوریت کا عبوری دور لانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان اس معاملے میں، صرف ایک ہی فرق نظر آتا ہے، وہ یہ کہ (۱) ان کے خیال کی رُو سے عوامی لیگ اپنے مقاصد میں مخلص نہیں ہے، جبکہ ولی نیپ مخلص ہے اور/یا (۲) یہ حقیقت بنائے امتیاز ہے کہ ولی نیپ پر مارکسسٹوں کا اثر حاوی ہے اور انھیں اس جماعت میں اپنا کام کرنے کی کہیں زیادہ آزادی حاصل ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں نمبر (۱) کے متعلق دلائل سے کوئی فیصلہ کن بات کہنی مشکل ہے۔ اگرچہ یہ معلوم کرنا مفید ہوگا کہ اس طرح کے شکوک و شبہات کی کیا کوئی مضبوط بنیاد موجود ہے۔ یہ درست ہے کہ عوامی لیگ سے ماضی میں بعض اہم وعدہ خلافیاں سرزد ہوئی ہیں، لیکن ایسا تو نیپ میں بھی ہوا ہے، حالانکہ نیپ میں مارکسسٹ سرکردہ حیثیت میں موجود تھے۔ باقی رہی یہ بات کہ ولی نیپ نے مارکسسٹوں کو عمل کی خاصی آزادی دے رکھی ہے تو یہ بات جزوی طور پر یقیناً درست ہے اور یہ بات اس وجہ سے ہے کہ مارکسسٹ وہاں خاصے فعّال ہیں اور ان سے پارٹی کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مارکسسٹ اگر عوامی لیگ میں بھی مستعد ہوتے، خواہ یہ بات عوامی لیگ میں ادغام کی بنا پر ہوتی یا اس صورت میں جو زیادہ سازگار ہوتی کہ مارکسسٹ ۱۹۵۷ء میں عوامی لیگ سے الگ ہونے اور نیپ بنانے اور اس میں شامل ہونے کی کوشش نہ کرتے، اس صورت میں آج عوامی لیگ کے اندر انھیں حسب ارادہ عمل کی خاصی آزادی حاصل ہوتی۔

اگر نیپ عوامی لیگ میں ضم ہو جاتی

نیپ میں مارکسسٹوں کو آج جس قدر آزادیٔ عمل حاصل ہے، اگر عوامی لیگ میں آزادی کی صورت اس سے کمتر ہوتی تو اس کی تلافی اس طرح ہو جاتی کہ عوامی لیگ ایک کہیں بڑی اور وسیع پارٹی تھی اور یہ بات بورژوا جمہوریت کی کامیابی کے لئے اس پارٹی کے حق میں بہت اہمیت رکھتی ہے جس میں مختلف طبقات کے لوگ شامل ہوں۔ ان میں سے کوئی مارکسسٹ اس حقیقت سے انکار نہیں کرے گا کہ مختلف طبقات کے محاذ کا جو خاکہ ان کے ذہن میں ہے، اس کی تشکیل آج عوامی لیگ کو شامل کئے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ جو اس وقت ایک ایسی سب سے بڑی عوامی طاقت ہے۔ جس نے طبقات کے امتیازات سے گزر کر عام لوگوں کی حمایت حاصل کی ہے۔ لہٰذا، اس بات کا سراغ لگانا چاہیے کہ دائیں بازو کے مارکسسٹوں نے حصولِ اتحاد کی اس واحد قابلِ عمل تجویز کو ماننے سے کیوں انکار کر دیا، میری مراد عوامی لیگ میں ادغام سے ہے اور اپنے اس انکار سے، ان طاقتوں کو تقسیم کر دیا جو اب اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے چل پڑی ہیں اور ہر ایک کی کوشش ہے کہ مقاصد بس وہ خود ہی حاصل کرے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس طرح کا ادغام مارکسسٹ طاقتوں کے خاتمے کے مترادف نہیں ہوگا، کیونکہ جیسا قیاس کیا جاتا ہے، غیر معروف مارکسسٹ گروپ عوامی لیگ کے پیچھے بھی اسی طرح اپنا وجود برقرار رکھتے، جس طرح آج وہ یقیناً نیپ کے پیچھے موجود ہیں۔ اس ادغام کا مفہوم بس یہی ہوتا کہ مختلف طبقات کا محاذ وسیع تر ہو جاتا اور وسیع تر محاذ کی تشکیل کا واحد قابلِ عمل طریقہ یہی تھا۔

ممکن ہے، اس موقع پر کوئی شخص یہ دلیل دے کہ نیپ نے جب اتحاد کا مطالبہ پیش کیا تھا تو اس وقت عوامی لیگ کے لئے دانشمندانہ بات یہ تھی کہ اس مطالبے کا جواب زیادہ ہمدردانہ پیرائے میں دیتی۔ یہ بات یقیناً درست ہے۔ لیکن مارکسسٹوں کو یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ عوامی لیگ، متوسط طبقے کے لوگوں کی قیادت میں کام کرنے والی ایک پارٹی ہے، جس میں مارکسسٹوں کی طرح کے مضبوط اور بے لوث افراد کے گروپ موجود نہیں جو اپنی قیادت پر دباؤ ڈال کر معقول باتیں منوا سکیں۔ شاید پرانی تلخیاں دیر میں دُور ہوتی ہیں۔ عوامی لیگ کے اندر بہت سے لوگوں کی نظر میں، انتخابات کے متعلق اس سے زیادہ اہم کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ قوم پرستانہ مظاہر کی پاکیزگی برقرار رکھی جائے اور ایسے کسی فرد کو اتحاد کی رعایت نہ دی جائے، جس نے ماضی میں خفیف سی کمزوری دکھائی ہو۔

کیا مارکسسٹ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتے تھے کہ ولی نیپ کو ایک ایسی پالیسی اختیار کرنے پر آمادہ کر لیتے جس سے خود اس کی نفی ہو جاتی؟ تنظیم میں اس کے اثر و رسوخ کی بنا پر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے۔

دائیں بازو کے مارکسسٹوں کی اس کارروائی کے نتائج کیا نکلے ہیں؟ ایسی کارروائیوں کے اپنے منطقی نتائج ہوتے ہیں، چنانچہ اب پھر یہ سننے میں آ رہا ہے کہ مارکسسٹ اور ولی نیپ کے لیڈر عوام کو عوامی لیگ کے مقاصد سے خبردار رہنے کی چیخ چیخ کر تاکید کر رہے ہیں۔ جوں ہی یہ لوگ مجیب کی اس فرضی معذوری کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ سامراج کے خلاف جنگ نہیں کر سکتے اور مغربی پاکستان کے استحصال پسندوں کو بنگال کا اصل دشمن تصوّر کرتے ہیں، عین اسی وقت مشرقی بنگال کو الگ کرنے کی سامراجی سازش کا سایہ ان کے سروں پر منڈلانے لگتا ہے۔ انتخابات میں عوامی لیگ کی مخالفت، ایک ایسی ضرورت ہے، جس کے تحت نیپ لامحالہ اختلافات ایجاد کرتی ہے، اور فریب دہی کی نیت کو عوامی لیگ کے سر تھوپتی ہے اور اس طرح نفاق کو اور بھی گہرا کرتی ہے۔ دائیں بازو کے مارکسسٹ اپنی کارروائیوں سے ایک ایسے متحدہ محاذ کے قیام کی امیدوں کا خاتمہ کر رہے ہیں، جو ان کی توقع کے مطابق بہت وسیع اور مختلف طبقات پر مبنی ہو سکتا ہے اور جاگیرداروں، اجارہ داروں اور سرمایہ داروں اور سامراجی مفادات کی حکومت کے خلاف جنگ کر سکتا ہے

ساقی جاوید

یہ جنگ کیسی!

مرے عزیزو! یہ جنگ کیسی
مرے رفیقو! یہ خون کیسا
یہ اپنے ہاتھوں میں سنگ کیسے
یہ اِن سروں میں جنون کیسا
مرے تمہارے یہ سارے لہجے
مری تمہاری یہ سب زبانیں
بھٹائیؒ جو بھی وڈّو رسالو[1]
چناب وراوی دیّی[2] داستانیں
مرا تمہارا عظیم ورثہ۔ عظیم دولت
تو پھر ہمارا کوئی قلم ہو
کوئی زباں ہو
کسی قلم سے لکھو عزیزو
کسی زباں میں لکھو مگر تم
وہ زخم لکھّو وہ درد لکھّو
وہ زخم جو ہر طرف سے ہم کو بلا رہے ہیں
وہ درد جو ہر گلی سے ہم کو پکارتا ہے۔
مرے رفیقو!
وہ گیت لکھّو وہ پیار لکھّو
وہ پیار جس کو ——
ہماری ماؤں نے لوریوں میں ہمیں دیا ہے۔
جو ہم نے ان کے سنہرے ہونٹوں پہ ہونٹ رکھ کر کبھی پیا ہے
کہ جس کے لکھنے کا عہد اپنی زمیں سے ہم نے کبھی کیا ہے۔
وہ دیکھو اپنے عظیم قائد کی بند آنکھیں
جو اپنی مٹّی میں سو رہی ہیں
وہ آج مرمر کی جالیوں سے
ہمارے چہروں کو پڑھ رہی ہیں
ہماری جانب سوال بن کر
وہ تیز قدموں سے بڑھ رہی ہیں۔

۱؎ (سندھی) بھٹائیؒ کا یہ عظیم رسالہ
۲؎ (پنجابی) کی

مقبول قریشی

غزل

دستِ گلچیں سے نہ دستورِ گلستاں سے اُلجھ
تجھ میں ہمت ہے تو پھر صبحِ گریزاں سے اُلجھ

عصرِ حاضر سے نہ کر تنگیٔ داماں کا گلہ
عزم کی جوت جگا نخوتِ یزداں سے اُلجھ

اب بھرے دہر میں دے گا نہ کوئی دادِ جنوں
شوق سے دھول اڑا خارِ مغیلاں سے اُلجھ

وہ کڑی دھوپ میں نکلے گی نہ گھر سے باہر
اب نہ اے دیدۂ پُرنم رہِ ویراں سے اُلجھ

صبر کے پھل کی توقع میں نہ کھو عمرِ عزیز
عجز سے ہاتھ اُٹھا شاخِ زرفشاں سے اُلجھ

آئینہ حضرتِ ناصح کو دکھایا بھی تو کیا!
آج پی ہے تو کسی صاحبِ عرفاں سے اُلجھ

***

جستہ جستہ

یہ واقعات اخبارات سے اخذ کئے گئے ہیں اور اس امر کا ثبوت ہیں کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے

"مہمانوں" کے لئے بہترین مکان

مغربی جرمنی کے ایک روزنامہ نے اس مضمون کا اشتہار شائع کیا ہے :-

برائے فروخت، فارم کا ایک مکان۔ اسطبل اور اناج گھر ساتھ ہیں۔ درختوں کے درمیان خوش وضع لان۔ از سر نو تعمیر کی بھی گنجائش ہے۔"

لیکن اس اشتہار کی عبارت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ آخر میں لکھا ہے۔ "گھوڑوں یا مہمان مزدوروں کی رہائش کے لئے بہترین ہے۔"

بدقسمتی سے "مہمان مزدوروں" کی اصطلاح، مغربی جرمنی میں غیر ممالک سے آنے والے مزدور پیشہ لوگوں کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد یہاں دس لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ اشتہار کی عبارت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی جرمنی میں ان "مہمانوں" کی پذیرائی کس طرح کی جاتی ہو گی۔

سبق آموز فلم

امریکی حکومت اسلحہ کی ناجائز خرید و فروخت کی کس طرح حوصلہ شکنی کرتی ہے، اس بارے میں عام لوگوں کو باخبر رکھنے کے لئے انتظامیہ نے ایک فلم تیار کرانے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام ایک فلم ساز کمپنی کے سپرد ہوا۔ فلم کا مقصد حکومت کی کارکردگی ظاہر کرنے کے علاوہ عوام کی ذہنی تربیت بھی تھا۔ فلم تیار ہو گئی۔ اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ امریکی پولیس اور خفیہ محکموں کے ایجنٹ اسلحہ کے ناجائز کاروبار کا ایک زبردست جال کس طرح توڑتے ہیں اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچاتے ہیں۔

فلم حکومت کی ضرورت کے مطابق تھی، لیکن اسے نمائش سے پہلے، جب کانگریس کے ارکان کو دکھایا گیا تو ان میں سے اکثر نے اپنا سر پیٹ لیا۔ بعض ارکان کے الفاظ میں "ایسی شہوت ناک اور مار دھاڑ سے بھرپور فلم" ہم نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کانگریس کے اجلاس میں ایک طویل بحث کے بعد فلم کی نمائش روک دی گئی۔

لیکن فلم کے پروڈیوسر اپنی تخلیق سے مایوس نہیں انھیں یقین ہے، فلم کے لئے مناسب مارکیٹ مل جائے گی اور تماشائیوں میں "ہٹ" جائے گی۔

تفصیل ایک مقدمے کی

یہ جاپان کی تاریخ میں سب سے طویل اور غالباً سب سے مہنگے مقدمے کی روداد ہے۔ اٹھارہ سال قبل ۱۹۵۲ء میں امریکہ کے خلاف ٹوکیو کے شہریوں نے ایک زبردست مظاہرہ کیا۔ مظاہرین میں سے ۲۶۱۔افراد گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد باقاعدہ مقدمہ شروع ہوا۔ جو ۱۷ سال اور ۹ ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران میں ۱۷۹۲ پیشیاں بھگتائی گئیں اور مقدمے کی دستاویزات کو جب تلے اوپر رکھا گیا تو ۶ میٹر کی بلندی تک پہنچ گئیں۔ عدالت کے خرچ کا اندازہ ۶ لاکھ ۱۱ ہزار ڈالر ہے۔ اس دوران میں ۲۶۱ میں سے ۶ "ملزموں" نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اللہ کو پیارے ہو گئے بہت سے افراد کی ملازمتیں ختم ہو گئیں کیونکہ انھیں بار بار عدالت میں پیشی بھگتنی ہوتی تھی، لیکن انجام اس مقدمے کا کیا نکلا؟ "ملزموں" کا "جرم" ثابت کرنا بیحد مشکل ہو گیا۔ چنانچہ ۱۱۰ افراد کو بری کر دیا گیا اور باقیوں کو سات ڈالر سے لے کر دو سال کی قید تک کی سزا دی گئی۔



محض برائے مزاح

ٹیکساس میں ایک ہیئر کٹنگ سیلون کے اندر اس مضمون کا اشتہار آویزاں ہے۔

گاہکوں سے التماس۔ ہمارے باربر کا ہنر اگر آپ کو پسند نہیں آیا تو بھی صبر سے کام لیجئے۔ اس کا ہاتھ کنگھے کے علاوہ پستول پر بھی صفائی سے چلتا ہے۔"

اسے سچ نہ جانئے، محض مذاق ہے، ٹیکساس کے مزاج کے عین مطابق۔

منافع کا کاروبار

ٹونے ٹوٹکے کے ماہر، کالے جادو اور سفلی عمل کے عامل، قسمت کا حال بتلانے والے نجومی، اور جھاڑ پونچھ سے لاعلاج مریضوں کو شفایاب کرنے والے "روحانی معالج" اب "تعلیم یافتہ اور بیدار" معاشرے میں بھی بے روزگاری اور کسمپرسی کی شکایت نہیں کر سکتے۔ فرانس میں ان کے لئے زراندوزی کی بڑی گنجائش ہے۔ فرانس کے اخبارات نے یہ اطلاع دی ہے یہاں کے "روحانی معالج" ۲ کروڑ ڈالر سالانہ کماتے ہیں۔ عاملوں اور "معجزہ دکھانے والوں" کا دھندا یہاں کے گلی کوچوں میں دن دہاڑے چلتا ہے۔ ان میں سے بعض تو اپنی کمائی میں سے انکم ٹیکس بھی ادا کرتے ہیں۔

پولیس کو پولیس کی تلاش

سان فرانسسکو میں پولیس کے لئے عملہ نہیں ملتا۔ نوجوان بھرتی ہونے کے لئے ادھر نہیں آتے۔ کیونکہ اس پیشے میں خطرات بہت ہیں۔ بلدیہ کے حکام نے اس مسئلہ کا ایک اور حل تلاش کیا ہے۔ انہوں نے پولیس کے عملے کو یہ تاکید کی ہے کہ ہر روز کی ڈیوٹی پوری کرنے کے بعد رنگروٹ پھانسنے کی مہم پہ دفتر سے نکل جایا کریں۔ جو پولیس والا ایک رنگروٹ بھرتی کرے گا، اسے ایک دن کی بامشاہرہ چھٹی ملے گی۔

قصۂ مختصر

ضلع گجرات میں کسانوں کی ہڑتال سے سنگین صورت حال پیدا ہو گئی۔

پولیس کی سنگین، ہر سنگین صورت حال کا جواب ہے۔

مظفر گڑھ میں تھانے کی چھت توڑ کر اسلحہ چرا لیا گیا۔

چھت کی حفاظت کے لئے دروازہ کھلا رکھئے۔

میں پاکستان کو متحد رکھنے کا تہیہ کر چکا ہوں (بھٹو)

خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے۔

خان قیوم عید کے بعد مجیب سے ملنے ڈھاکہ جائیں گے۔ (ایک تازہ خبر)۔

مجیب پاکستان کو تباہ کرنا چاہتے ہیں، خان قیوم کا دعویٰ (ایک پرانی خبر)۔

جماعت اسلامی اقتدار نہیں، اسلامی نظام چاہتی ہے (مولانا فتح محمد)

انگور کھٹے ہیں۔

"سامراجی ملک ہمیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں" ہر شعبے میں ایک امریکی مشیر گھسا بیٹھا ہے

ڈاکٹر گیان چند

ہندوستان کے اقتصادی ماہر ڈاکٹر گیان چند نے اپنے سابقہ مضمون (مطبوعہ ۱۴ فروری) میں سرمایہ داروں اور زمینداروں کے ساتھ نوکر شاہی کے گٹھ جوڑ کا تذکرہ کیا تھا۔

اس مضمون میں انہوں نے ہندوستان کے وسائل پیداوار پر امریکی اور برطانوی سامراج کے قبضے کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ سامراج کسی نوآزاد ملک کو اپنا محتاج اور تابع کس طرح بناتا ہے، یہ بات ذیل کی سطور میں ملاحظہ کیجئے۔ ان میں ہمیں اپنے ملک کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔

ہندوستان کے سلسلے میں ایک اور بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ہم نے ہمیشہ غیر ملکی امداد پر انحصار کیا اور جس قدر غیر ملکی امداد ہمیں حاصل ہوئی ہے، روس کی امداد اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں کی امداد اس کے پانچویں یا چھٹے حصے کے برابر ہے باقی امداد امریکہ اور اس کے حلیف ملکوں کی طرف سے موصول ہوئی ہے، جو فی الحال ہمارے سب سے اہم قرض خواہ ہیں۔ ان حالات کے نتیجے میں ہمارا اقتصادی انحصار، عالمی بنک اور برطانیہ فرانس، اٹلی، جاپان اور آسٹریلیا جیسے ملکوں کے توسط سے امریکہ پر بڑھتا گیا ہے، جب کہ یہ ملک بجائے خود بھی امریکہ کے کنٹرول میں ہیں۔ اس میں یہ حقیقت بھی شامل کر لیجئے کہ غیر ملکی امداد سے حاصل ہونے والے سرمائے کو نہایت بری طرح استعمال کیا گیا ہے ہم نے "امداد" کی صورت میں چھ ہزار کروڑ غیر ملکی قرضے کا سودا کیا ہے۔ اس کے لئے ہمیں اصل سرمایہ اور اس کا سود واپس کرنا پڑے گا۔ اور ہمارے پاس ایسی کوئی رقم نہیں، جس سے واپسی کی بندوبست ہو ہمارے پاس غیر ملکی زرمبادلہ نہیں ہے

ملک کے وسائل، غیروں کے تصرّف میں

ہماری غیر ملکی تجارت کا بیشتر حصہ غیر ملکی فرموں کے ہاتھ میں ہے۔ جو در اصل برطانوی ہیں اور کسی حد تک شمالی امریکہ کی ہیں۔ ہماری غیر ملکی جہاز رانی کا دس سے پندرہ فی صد حصہ ہندوستانی ہے، باقی نجی ہاتھوں میں ہے ان میں جاپان، شمالی امریکہ، برطانیہ یونان اور ہالینڈ کے حصے شامل ہیں۔ غیر ملکی تجارت بڑی حد تک انہی غیر ملکی جہازوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

آزادی سے پہلے انگریز" ہماری معیشت کے نہایت اہم شعبوں پر قابض تھے آزادی کے بعد سے ہندوستان میں برطانیہ کی سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی امریکہ جرمنی اور جاپان نے بھی یہاں اپنا سرمایہ لگایا ہے یہ غیر ملکی تصرفات ہماری انتہائی اہم برآمدی صنعتوں میں اپنا کام کر رہے ہیں مثال کے طور پر نقدی اجناس کے کاروبار پر ان کا کنٹرول ہے، جن سے ہم غیر ملکی زرمبادلہ کماتے ہیں۔ تمام غیر ملکی تجارت، غیر ملکی بنکوں کے کنٹرول میں ہے یہی غیر ملکی بنک اسے سرمایہ بھی فراہم کرتے ہیں لہٰذا انہیں ہندوستان کو اپنے تصرف میں لینا ہوگا۔ اس اقدام کی بابت ہمیں اب نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے سوچنا چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ یہ غیر ملکی بنک، بیشتر صورتوں میں برطانوی بنکوں کی شاخیں اور برطانیہ، امریکی سامراج کا چھوٹا بھائی بنا ہوا ہے لہٰذا یہ بنک بھی بالواسطہ طور پر امریکہ کے کنٹرول میں ہیں۔ اس طرح ہندوستان کی اپنی بڑی تجارت بڑی بڑی غیر ملکی اجارہ داریوں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے

غیر ملکی کمپنیوں کے ہتھکنڈے

ہندوستان کے نقطۂ نظر سے ہماری اپنی اجارہ داریاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن برطانیہ اور امریکہ کی بڑی بڑی مغربی اجارہ داریوں کے مقابلے میں یہ بہت ہی کم حیثیت ہیں ہمارے دیسی اجارہ داروں کو یہ معلوم ہے کہ ان کا مفاد غیر ملکی اجارہ داروں کے مفاد کے تابع ہے۔ چنانچہ غیر ملکی اجارہ دار انہیں کنٹرول کرتے ہیں۔ انہیں اپنی ثانوی حیثیت کا شریک کار بناتے ہیں اور پھر انہی کے ذریعے ہندوستان کی معیشت پر اپنا قبضہ قائم رکھتے ہیں دوسری بڑی صنعتیں، اجارہ داریاں اور ایوان ہائے تجارت یہ سب برطانوی، امریکی اور جاپانی فرموں کے چھوٹے بھیگے حصے دار ہیں، چنانچہ انہی غیر ملکی اجارہ داریوں کے توسط سے ہماری معیشت ملک میں اپنا نفوذ کرتی ہے۔ لیکن محض اتنا ہی نہیں ہے۔ امداد کے ذریعے، امریکی ہمارے تعلیمی اداروں اور ہماری زرعی ترقیات کو بھی کنٹرول کر رہے ہیں۔ اُن کے مشیر ہر جگہ مصروف ہیں جو نہایت چالاکی اور مستعدی سے، نجی سرمایہ کاری اور غیر ملکی مفادات کے نفوذ کے حق میں پروپیگنڈہ کر رہے ہیں

علاوہ ازیں، غیر ملکی مشیر، حکومت کے ہر شعبے میں موجود ہیں، منصوبہ بندی کمیشن میں، وزارتِ خزانہ میں، وزارت تعلیم میں، وزارت صنعت میں، تجارت و خوراک کی وزارت میں، حتیٰ کہ ریزرو بینک اور انڈین سٹیٹ بنک میں بھی غیر ملکی مشیر براجمان ہیں، یہ غیر ملکی مشیر فنی امور کے ماہر نہیں بلکہ سیاسی ایجنٹ ہیں، جو ہماری معیشت، ہماری انتظامیہ اور ہمارے تعلیمی اداروں پر کنٹرول قائم کر رہے ہیں، جس کے اثرات گہرے اور دوررس ہوں گے۔ ہماری اعلیٰ سطح کے معلموں میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو امریکہ کی طرف دیکھتے ہیں جو امریکی فاؤنڈیشن پر نظریں جمائے رہتے ہیں، مثلاً فورڈ فاؤنڈیشن ہے اور راک فیلر فاؤنڈیشن ہے تاکہ ان کی طرف سے انہیں مواقع ملتے رہیں ان مفادات پر ان کی رال ٹپکتی ہے۔

ہمارے حکمران طبقوں کو غیر ملکی سرمایے کے اس نفوذ کا قطعاً احساس نہیں، امریکہ، برطانیہ اور جاپان طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، تاکہ ہماری معیشت، ہماری

انتظامیہ اور ہمارے تعلیمی اداروں پر مکمل قبضہ جماتے ہوئے اپنی گرفت اور مضبوط کریں ۔

غیر ملکیوں کا کنٹرول بعض اوقات پُر فریب ہوتا ہے کیونکہ کہیں کہیں صنعتوں میں ا ۵ فیصد حصّہ ہندوستانی مفادات کے تابع ہے، لیکن معمول کے اس ا ۵ فی صد سے موثر کنٹرول کی حیثیت واضح نہیں ہوتی اصول کی حد تک تو ایسا ہی ہوتا ہے مگر نام نہاد شراکتی منصوبوں کے مالک، جن کے مفادات بظاہر اقلیت میں ہوتے ہیں، ان صنعتوں پر اپنا مکمل کنٹرول رکھتے ہیں اس ضمن میں اگر ہم معاہدے کی شرائط کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ قانونی اکثریت کو موثر کنٹرول حاصل نہیں ہوتا ۔

بدقسمتی سے ہندوستانیوں کے ساتھ غیر ملکیوں کی یہ ساری نام نہاد شراکت اور اصل ہندوستانیوں پر غیر ملکیوں کے مکمل کنٹرول کے مترادف رہی ہے یہ ایک اور مذموم سازشی ہتھکنڈہ ہے، جس کے تحت ہماری معیشت پر غیروں کا قبضہ رہا، اور ہم اس صورتِ حال کا اندازہ ہی نہیں کر سکے ۔ یہ معاملہ اثر و نفوذ کا ہے، اور اس بنا پر ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ ہمیں چونکہ ا ۵ فیصد مالکانہ حقوق حاصل ہیں، لہٰذا ہم ہی مالک ہیں، مالک اصل میں ہمارے شریک کار ہیں ۔ ہم تو محض ان کا حکم بجالاتے ہیں ۔

افراطِ زر سے دولت مندوں کو فائدہ پہنچا

اس تمام صورتِ احوال میں ہمیں اس حقیقت کو بھی شامل کرلینا چاہئے کہ گذشتہ دس سال میں ہمارے یہاں قیمتوں میں دگنے سے بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے ۔ دوسری طرف ہماری حقیقی آمدنی یعنی مزدوروں اور بے زمین کسانوں کی آمدنی اس عرصے میں کم ہوئی ہے ۔ ہمارے درمیانہ طبقے بھی سمٹ کر کم ہوگئے ہیں اور افراطِ زر کے فائدے دولت مندوں کو حاصل ہوئے ہیں دولت مندوں نے اپنی دولت میں اضافہ کیا ہے ۔ اور اپنی آمدنی میں اضافہ کیا ہے ۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے انھوں نے پورے ملک کے مفادات بیچ دیئے ہیں ۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا ہے کہ افراطِ زر کے ہاتھوں عوام انتہائی شدید حالات میں زندگی گذارنے پر مجبور ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر ترقی ہوئی ہے، وہ سب عوام کی مخالفت میں ہوئی ہے، سوشلزم کے خلاف ہوئی ہے اور عوام کے مفادات کو اس سے جس قدر نقصان پہنچا ہے، اس کے اثرات سے نجات پانے میں اس ملک کو زبردست جدوجہد کرنی پڑیگی ۔

اس کے لئے ہمیں ایک عظیم سوشلسٹ نظام کی ضرورت ہے، بائیں بازو کی طاقتوں کے درمیان زبردست اتحاد درکار ہے ۔ یہ اتحاد فی الوقت موجود نہیں، لہٰذا اس بات کے مواقع بہت کم ہیں کہ ہم عوام دشمن اور سوشلسٹ دشمن طاقتوں کو، جو پوری طرح متحد ہیں، شکست دے سکیں گے، اس لئے جہاں تک عوام اور سوشلزم کے مفادات کا تعلق ہے، ان کے نقطہ نظر سے، ہمیں کوئی دل خوش کن امکان نظر نہیں آتا ۔

ضروری بات کیا ہے ؟

یہ تو ملک میں تبدیلیوں کی وہ صورت ہے، جو رونما ہو چکی ہے، چنانچہ موجودہ رجحانات کو ہم جب تک بالکل منقلب کرنے کا فیصلہ نہیں کرینگے، ہم سوشلزم جیسی کسی بات کو بروئے کار نہ لاسکیں گے بلکہ اس دوران میں عوام کا افلاس اور زبردست طبقوں کی دولت بڑھتی جائے گی ۔

یہ بات ملک کی معیشت کے لئے تباہ کن رہی ہے لیکن حکومت کے اندر، اب کہیں جاکر یہ شعور پیدا ہوا ہے کہ یہ صورتِ حال تباہ کن رہی ہے ۔

ہمیں اپنے ملک میں ایک زبردست جمہوری تحریک کی ضرورت ہے، جیسا کہ یہ بات عام ہے، بایاں بازو ہمارے ملک میں متحد نہیں ۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیاں تین چار ٹکڑوں میں بٹ چکی ہیں ۔ خود کانگریس پارٹی، جسے ایک سوشلسٹ پارٹی ہونا چاہیئے، سرے سے سوشلسٹ پارٹی نہیں ہے ۔ حالیہ بحران کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعض لیڈروں کو یہ احساس ہوا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیئے ۔ ورنہ ملک میں زبردست الٹ پھیر ہوجائے گا ۔ اور یہ کہ سب سے نچلے اور نادار طبقوں کے لوگ اب مزید صبر سے کام نہیں لیں گے ۔

ہم تمام شعبوں میں سوشلزم چاہتے ہیں اور نہ صرف صنعت کو بلکہ اپنی قومی زندگی کے ہر پہلو کو سوشلزم سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں ۔ تاہم یہ سادہ سی بات ہماری حکومت کی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تک سوشلسٹ برسر اقتدار نہ آئیں ۔ اور کلیدی عہدوں پر قابض نہ ہوں، سوشلسٹ معیشت قائم نہیں کی جاسکتی ۔ ہماری انتظامیہ میں ایسے لوگ برسرکار رہے ہیں ۔ جو نہ صرف یہ کہ سوشلزم میں یقین نہیں رکھتے بلکہ انہوں نے بڑے بڑے امریکی اور ہندوستانی سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے ۔

چودہ اہم بینکوں کو قومی ملکیت میں لیا جاچکا ہے اور اگر ان بینکوں کو، عوامی مالی اداروں کی حیثیت سے چلانا مقصود ہو تو ہمیں اپنے مقاصد میں بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی ۔ اور انہیں چلانے کا انداز تبدیل کرنا ہوگا ۔ اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بینکنگ کی صنعت میں ان کے داخلی تعلقات کی نہج سرے سے بدلنی ہوگی ۔

قیمتوں میں
دُگنا اضافہ ہوا ہے
محنت کشوں کی آمدنی
گھٹ گئی ہے

چار پانچ اہم مالی ادارے یعنی پبلک ادارے موجود ہیں، جو ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جنہیں سوشلسٹ مقاصد سے کوئی ہمدردی نہیں اور جیسا کہ میں نے کہا ہے، مفاد پرستوں سے ان کا گٹھ جوڑ ہے ۔ یہ عناصر ان بینکوں کے سارے وسائل بڑے سرمایہ داروں کے مفاد میں استعمال کرتے ہیں ۔ سوشلزم کو بروئے کار لانا ان کا مقصود نہیں ۔ یہی کچھ منصوبہ بندی میں ہو رہا ہے ۔ یوں ہندوستان میں بہت ناقص رہی ہے ۔ ہمارے یہاں منصوبہ بندی کرنے والوں کو سوشلزم پر کبھی یقین نہیں رہا اور نہ آج وہ اس پر یقین کرتے ہیں ۔ چوتھا پنجسالہ منصوبہ، سوشلسٹ منصوبہ نہیں ہے اور پلاننگ کمیشن کے ارکان کی اکثریت، نہ صرف یہ کہ سوشلسٹ نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ سوشلزم کے کٹر مخالف ہیں ۔ جب تک ہمارا کوئی پلاننگ کمیشن نہیں ہوتا، ایک سوشلسٹ انتظامیہ نہیں ہوتی اور سیاسی حلقوں میں تمام کلیدی مناصب پر سوشلسٹوں کا قبضہ نہیں ہوتا ۔ سوشلسٹوں کے دشمن، جو فی الوقت با اختیار عہدوں پر ڈٹے بیٹھے ہیں ۔ ہندوستان اور غیر ملک کے بڑے سرمایہ داروں کی مدد سے ملک کو مختلف سمت میں دھکیل کر لے جانے میں کامیاب ہوجائیں گے ۔ اور اس وقت وہ جمہوریت کے بلند بانگ دعوے کرتے رہیں گے ۔ جب کہ درحقیقت وہ ایک نیم فسطائی معیشت اور انتظامیہ کا اقتدار قائم کریں گے ۔

بیوروکریسی ختم کی جائے

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آج ہمارے عوام کے اہم ترین فرائض میں سے ایک فرض یہ ہے کہ بیوروکریسی (افسر شاہی) کو عوامی اختیار کے تابع کریں ۔ اب اگر ہم افسر شاہی کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اپنے نظم و نسق کو بدلنا ہوگا ۔ موجودہ افسر شاہی سر سے پاؤں تک رجعت پسند اور قدامت پرست ہے اور جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے ہندوستان میں بھی بڑے سرمایہ داروں سے اس کا گٹھ جوڑ ہے ۔

اگر ریاست نے کلیدی شعبوں میں اپنے بھرپور اختیارات استعمال کئے تو اس سے ساری معیشت کی تجدید ہوگی اور اس کا یہ کردار رہنمائی کا ہوگا، اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملکیت کے لحاظ سے نجی سرمایہ کاری، پبلک سرمایہ کاری کے مقابلے میں، کہیں زیادہ اہم ہے ۔ تاہم نجی سرمایہ کو عوامی مفادات کے تابع اسی طرح کیا جاسکتا ہے ۔ ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے کہ سرکاری سرمایہ آج کل کے مقابلے میں، زیادہ فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے ۔ بشرطیکہ ہم ایسا کرنا چاہیں اور سوشلزم کا حصول واقعی ہمارے دل کی بات ہو ۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں سوشلسٹ مقاصد کے لئے معیشت کے اہم شعبوں کو قومی ملکیت میں لینا ہوگا ۔

افریقی ممالک : ایک نظر میں

نو آزاد افریقی ارکان نے، جنوبی افریقہ کو ہتھیار سپلائی کرنے کے فیصلے پر ڈٹ کر احتجاج کیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ ممالک اب سامراج کی اطاعت نہیں کریں گے۔ افریقی ملکوں کا یہ اتحاد، ایک نیک شگون ہے۔ اِن اوراق پر افریقی ملکوں کے وسائل دولت، اور ان کے عام حالات کا ایک سرسری تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔



شمالی افریقہ

ملک کا نام	دارالحکومت	رقبہ (مربع میل)	آبادی	بندرگاہ
مصر	قاہرہ	۳,۸۶,۰۰۰	۳ کروڑ ۹۰ لاکھ	اسکندریہ، پورٹ سعید
لیبیا	ٹریپولی، بن غازی	۶,۷۹,۳۵۸	۱۵ لاکھ ۶۰ ہزار	ٹریپولی، بن غازی
تیونس	تیونس	۴۸,۳۰۰	۴۵ لاکھ ۶۵ ہزار	تیونس
الجزائر	الجزائر	۹,۱۹,۳۵۲	۱ کروڑ ۲۳ لاکھ	الجزائر، اوران
مراکش	رباط	۱,۷۱,۵۸۳	۱ کروڑ ۸۰ لاکھ	کیسابلانکا، تنجیر
سوڈان	خرطوم	۹,۶۷,۵۰۰	۱ کروڑ ۳۶ لاکھ	پورٹ سوڈان
ایتھوپیا	عدیس ابابا	۴,۵۷,۱۴۸	۲ کروڑ ۲۲ لاکھ	مصاوا
چاڈ	فورٹ لامی	۴,۵۵,۵۹۸	۲۸ لاکھ ۳۰ ہزار	-
نائیجر	نیامے	۵,۰۱,۹۳۰	۳۲ لاکھ	-
مالی	باماکو	۵,۸۴,۹۴۲	۴۴ لاکھ ۳۰ ہزار	-
صومالی لینڈ	جبوتی	۸,۴۹۲	۸۰ ہزار	جبوتی

مغربی افریقہ

ہسپانوی صحرا	الایوم	۱,۰۳,۲۴۳	۴۲ ہزار	الایوم
موریطانیہ	نواک شاٹ	۳,۲۸,۱۸۵	۱۰ لاکھ	نواک شاٹ
سینیگال	ڈاکار	۷۷,۴۰۱	۳۴ لاکھ	ڈاکار
گیمبیا	باتھرسٹ	۴,۰۳۳	۳ لاکھ	باتھرسٹ
پرتگالی گنی	باؤ	۱۳,۹۴۸	۵ لاکھ ۲۵ ہزار	-
گنی	کوناکری	۹۶,۵۲۵	۳۴ لاکھ ۲۰ ہزار	کوناکری
سیرالیون	فری ٹاؤن	۲۷,۹۲۵	۲۲ لاکھ	فری ٹاؤن
لائبیریا	منرودیا	۴۳,۰۰۰	۱۰ لاکھ	منرودیا
آئیوری کوسٹ	عیبی جان	۱,۲۳,۳۹۷	۳۷ لاکھ ۵۰ ہزار	عیبی جان
اپر وولٹا	اواگاڈوگو	۱,۰۵,۸۴۱	۴۷ لاکھ ۶۳ ہزار	-
گھانا	عکرہ	۹۱,۸۴۴	۷۶ لاکھ	ٹیما
ٹوگو	لومے	۲۰,۷۳۳	۱۶ لاکھ ۴۲ ہزار	-
ڈاہومی	پورٹونووو	۴۳,۴۷۱	۲۳ لاکھ	-
نائیجیریا	لاگوس	۳,۵۶,۰۹۳	۵ کروڑ ۴۶ لاکھ	لاگوس، پورٹ ہارکورٹ

وسطی افریقہ

کیمرون	یاؤنڈی	۱,۷۸,۳۶۸	۵۱ لاکھ ۵۰ ہزار	ڈوالا
استوائی گنی	سانٹا ازابیل	۱۰,۸۳۶	۲ لاکھ ۶۷ ہزار	-
گیبون	لیبرول	۹۰,۷۳۳	۴ لاکھ ۶۲ ہزار	-
جمہوریہ مرکزی افریقہ	بنگوئی	۲,۳۹,۳۸۲	۱۳ لاکھ ۲۰ ہزار	-
جمہوریہ کانگو (برازویل)		۱,۷۵,۶۷۶	۱۰ لاکھ ۱۳ ہزار	پوائنٹ نوائر
جمہوریہ کانگو (لیوپولڈول)	کنشاسا	۹,۰۲,۲۷۴	۱ کروڑ ۵ لاکھ	ماتاری
انگولا	لوانڈا	۴,۸۱,۳۵۱	۵۱ لاکھ ۱۹ ہزار	لوبیٹو، لوانڈا
زیمبیا	لوساکا	۲,۹۰,۳۲۰	۳۷ لاکھ ۱۰ ہزار	-
جمہوریہ صومالی	موگادیشو	۲,۶۲,۰۰۰	۲۳ لاکھ ۵۰ ہزار	-
کینیا	نیروبی	۲,۱۹,۷۳۰	۹۳ لاکھ ۷۶ ہزار	ممباسہ، کلن دینی
یوگنڈا	کمپالا	۸۰,۳۰۱	۷۵ لاکھ ۵۱ ہزار	-
روانڈا	کگالی	۱۰,۱۶۹	۳۰ لاکھ ۱۸ ہزار	-
برونڈی	بوجمبورا	۱۰,۷۴۷	۲۷ لاکھ ۸۰ ہزار	-
تنزانیہ	دارالسلام	۳,۴۳,۷۲۶	۱ کروڑ ۲۵ لاکھ ۱۴ ہزار	دارالسلام، زنجبار
ملاوی	زومبا	۳۶,۸۲۹	۳۹ لاکھ	-

جنوبی افریقہ

جنوب مغربی افریقہ	ونڈھوک	۳,۱۷,۸۲۵	۵ لاکھ ۳۱ ہزار	ویلوس بے
بوٹسوانا (بچوانالینڈ)	گبرونز	۲,۲۲,۰۰۰	۵ لاکھ ۳۹ ہزار	-
رہوڈیشیا	سالسبری	۱,۵۰,۳۳۳	۴۲ لاکھ ۵۰ ہزار	-
موزمبیق	لورینکومارکیس	۲,۹۷,۷۳۱	۶۹ لاکھ ۱۴ ہزار	موزمبیق، لورینکومارکیس
جمہوریہ ملاگاسی	تناناریو	۲,۴۱,۰۰۴	۶۱ لاکھ ۸۰ ہزار	تماتیو
لیسوتھو (بسوتولینڈ)	ماسورو	۱۱,۷۱۶	۷ لاکھ ۴۵ ہزار	
سوازی لینڈ	مبابنے	۶,۷۰۴	۲ لاکھ ۹۲ ہزار	
جنوبی افریقہ	کیپ ٹاؤن	۴,۷۲,۷۳۳	۱ کروڑ ۷۵ لاکھ	ڈربن، کیپ ٹاؤن، پورٹ الزبتھ
ماریشس (جزیرہ)	پورٹ لوئی	۷۲۳	۷ لاکھ ۴۳ ہزار	پورٹ لوئی
ری یونین ″	سینٹ ڈینس	۹۷۳	۳ لاکھ ۸۷ ہزار	سینٹ ڈینس
کومورو ″	موروانی	۸۴۹	۲ لاکھ ۱۲ ہزار	-
سیچیلز ″	وکٹوریہ	۱۵۷	۴۶ ہزار	وکٹوریہ

۱-لیبیا ۲-الجیریا ۳-مراکش ۴-مارتینیا ۵-مالی ۶-نائیجر ۷-چاڈ ۸-نائیجیریا ۹-کیمرون ۱۰-سنٹرل افریقہ ۱۱-جمہوریہ کانگو ۱۲-انگولا ۱۳-جنوب مغربی افریقہ
۱۴-بچوانالینڈ ۱۵-جنوبی افریقہ ۱۶-رہوڈیشیا ۱۷-زمبیا ۱۸-موزمبیق ۱۹-تنزانیہ ۲۰-کینیا ۲۱-صومالیہ ۲۲-ایتھوپیا ۲۳-سوڈان ۲۴-مصر

دولت مند برِّ اعظم افریقہ اور اُس کے نادار ملک

افریقہ دنیا کا دوسرا بڑا براعظم ہے اس کا رقبہ ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ۵۰ ہزار مربع میل اور آبادی ۳۰ کروڑ ۴۰ لاکھ ہے اس کے شمال میں بحیرۂ روم اور شمال مشرق میں بحیرۂ قلزم ہیں۔ مشرق اور جنوب میں بحرِ ہند اور مغرب میں بحرِ اوقیانوس ہے۔ افریقہ میں پہاڑ کم ہیں، جنگلات زیادہ ہیں جہاں اب بھی بعض پسماندہ قبائل آباد ہیں۔ افریقہ کے چار بڑے دریا ہیں دریائے نیل جو ۴ ہزار میل لمبا ہے اس کی ایک شاخ یوگنڈا اور دوسری حبشہ سے نکلتی ہے۔ دریائے نائیجر دو ہزار چھ سو میل لمبا ہے یہ سیرالیون کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے، دریائے کانگو دو ہزار نو سو میل لمبا ہے یہ افریقہ کی وسطی پہاڑیوں سے نکلتا ہے دریائے ذیمبری سولہ سو میل لمبا ہے یہ جنوبی افریقہ سے نکلتا ہے۔ افریقہ میں زیادہ تر بنتو، سائی، زولو، عیادن، کلوتما اور سانو قبائل ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں پرتگال، برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ نے افریقہ کے ساحلی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کیا، اور یہاں سے افریقی عوام کو پکڑ کے یورپی منڈیوں میں ان کی فروخت شروع کردی۔ آہستہ آہستہ ان سامراجی ملکوں نے سارے افریقہ پر قبضہ کرلیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد افریقی ملک آزاد ہونے لگے۔ ۱۹۳۸ء میں افریقہ کا ۴ کروڑ ۲۲ لاکھ مربع کلومیٹر رقبہ اور ۹۶ کروڑ آبادی نوآبادیاتی علاقوں پر مشتمل تھی، جو دنیا کے کل رقبہ اور آبادی کا ہزارم اکثر احصہ تھی۔ ۱۹۶۵ء میں صرف ۶۹ لاکھ مربع کلومیٹر رقبہ اور ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ آبادی نوآبادیاتی تسلط میں رہ گئی۔ پرتگال اور ہسپانیہ کے زیر تسلط یہ علاقے پرتگالی گنی، انگولا، موزمبیق اور ہسپانوی صحرا ہیں۔

افریقی ملکوں کی آبادی رقبہ اور پیداوار کا جائزہ لینے کے لئے ہم اسے چار حصوں، شمال، مغربی، وسطی، اور جنوبی میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

شمالی افریقہ کی خاص پیداوار

شمالی افریقہ کے ملکوں میں گندم، جو، کپاس، تمباکو، پھل، زیتون اور سنگترہ پیدا ہوتے ہیں۔ صحرائی علاقوں میں کھجور پیدا ہوتی ہے، مصر اور سوڈان اعلیٰ قسم کی کپاس پیدا کرنے والے ملکوں میں شامل ہیں۔ مصر، لیبیا اور الجیریا کی معدنی دولت میں تیل سب سے اہم ہے۔ تیل کی آمدنی کی وجہ سے ان ملکوں میں صنعتی ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے۔ دریائے نیل کی وادی اور شمالی ساحلی علاقوں کے علاوہ سارا شمالی افریقہ ریگستانی ہے۔ اس علاقے کے بڑے بڑے شہر ساحلِ سمندر پر واقع ہیں۔ صحرا میں خانہ بدوش قبائل آباد ہیں۔ نہر سویز کی وجہ سے مصر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جسے مصر نے ۱۹۵۶ء میں قومی ملکیت میں لے لیا تھا۔

مغربی افریقہ کی خاص پیداوار

اس علاقے کے ملکوں کی خاص پیداوار، کوکو، کیلا، کافی، ربڑ چاول، مونگ پھلی اور جوار وغیرہ ہے، معدنیات میں سونا، لوہا، بکسائیٹ اور مینگنیز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، گنی، سیرالیون، لائبیریا، اور آئیوری کوسٹ اور گھانا میں ہیرے کی کانیں بھی ہیں، نائیجریا میں لاگوس، پورٹ ہار کورٹ وغیرہ بڑے صنعتی مرکز ہیں۔ اس علاقے میں تیل بھی ہے۔

وسطی افریقہ کی خاص پیداوار

اس علاقے میں کانگو سب سے بڑا ملک ہے۔ کینیا میں کچھ ہندو بھی آباد ہیں۔ یوگنڈا، کینیا، اور تنزانیہ میں یورپی لوگ خاصی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اس علاقے کے قبائل بنتو زبان بولتے ہیں، پیداوار میں عمارتی لکڑی، مکئی، گندم، جوار، کپاس، گنا، تمباکو، کوکو، کافی، چائے وغیرہ شامل ہے۔ ساحلی علاقوں میں تاڑ، ناریل، کیلا، اور لونگ پیدا ہوتے ہیں۔ مغربی ساحل پر پیٹرول ملتا ہے۔ شمالی وسطی علاقے میں تانبا اور کوبالٹ مینگنیز وغیرہ دستیاب ہوتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کی خاص پیداوار

پورے براعظم میں اس علاقے کی آب و ہوا نسبتاً زیادہ اچھی ہے، اور یہ علاقہ معدنی دولت سے مالامال ہے۔ خصوصاً سونا، ہیرے، چاندی، تانبے، اور مینگنیز کی کانیں اسی علاقہ میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سامراجی ملکوں کی توجہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ جنوبی افریقہ اور روڈیشیا پر سفید فام اقلیت کی حکمرانی ہے۔ موزمبیق اور انگولا پرتگالی نوآبادیاں ہیں جو ابھی تک پرتگالی سامراج سے آزادی نہیں حاصل کرسکیں۔ ہیرے کی سب سے بڑی کان کیمبرلے میں واقع ہے اور سونے کی سب سے بڑی کان اسی جنوبی افریقہ کے علاقے جوہنسبرگ میں واقع ہے، یہ علاقہ دنیا میں سب سے زیادہ سونا پیدا کرتا ہے۔

اس علاقے کے مشرقی اور جنوبی ساحل پر ناریل، گنا، کیلا، اور اندرونی حصوں میں مکئی، گندم، تمباکو، چائے اور کپاس پیدا ہوتی ہے۔

چار حصوں کی آبادی۔ رقبہ اور بندرگاہ و دارالحکومتوں کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے۔

سامراج کو افریقے سے

سوشلزم کی فتح، او

افریقہ میں ۴۱ حکومتیں آزاد اور خود مختار ہیں۔

ہے۔ یہ پورے براعظم کے ۹۰ فیصد رقبے کے برابر ہے۔ ا

کی آبادی کا ۲

ظہیر اخ

افریقہ، یورپ اور امریکہ کے لئے کئی صدیوں تک غلاموں کی سب سے بڑی شکارگاہ" اور دنیا بھر میں جانوروں سے بھی زیادہ سستے خدمت گار مہیا کرنے کی منڈی رہا ہے۔ انسانی تاریخ میں اس براعظم کو ایشیا سے بھی زیادہ پسماندہ مظلوم اور غیر انسانی سلوک کا سزاوار سمجھا گیا ہے۔ لیکن یورپ اور امریکہ کی تین صدی کی غلامی کے بعد اب افریقہ، اس طرح بیدار ہوا ہے کہ اس نے ماضی کی محرومیوں کی تلافی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ امریکی صحافی جان گنتھر نے، جو اپنے سلسلہ تصانیف "ان سائڈ" کے لئے بہت مشہور ہیں ۱۹۵۵ء میں ان سائڈ" افریقہ میں لکھا تھا۔ "ایشیا کا بڑا حصہ تو ہاتھ سے گیا، لیکن ابھی افریقہ باقی ہے۔" اس موثق اعلان" کو ابھی بمشکل چند سال گزرے تھے کہ استعمار کی کڑیاں ٹوٹنے لگیں اور سامراج نے دیکھ لیا کہ افریقہ بھی ہاتھ سے جا رہا ہے۔



زمبابوا کے گوریلائے جنگ

...بھی نکلنا پڑے گا

...ریشیا کی فتح ہے

...کی ریاستوں کا مجموعی رقبہ دو کروڑ ۰، لاکھ کیلومیٹر ...آزاد ریاستوں کی کل آبادی ۳۰ کروڑ ہے جو کل افریقہ ...فیصد ہے۔

...ت بیداری

افریقہ میں آزادی کی فصلِ نو بہار کا پہلا نقیب لیبیا ہے۔ لیبیا کی خود مختار حکومت ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئی۔ اس کے بعد مراکش اور تیونس نے ۱۹۵۶ء میں آزادی حاصل کی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سب سے پہلے گھانا نے مارچ ۵۷ء میں آزادی حاصل کی تھی۔ ڈیڑھ سال بعد گنی نے اس کی تقلید کی۔ لیکن بہارِ آزادی کا حقیقی سیلاب تو ۱۹۶۰ء میں آیا۔ اس تاریخی "افریقی سال" میں افریقہ کی نو آزاد ریاستوں میں سترہ کا اضافہ ہوا جو ریاستیں پہلے سے آزاد تھیں ان کے نام یہ ہیں حبشہ، گھانا گنی، لائبیریا، لیبیا، مراکش، سوڈان، تیونس، اور متحدہ عرب جمہوریہ، ۱۷ نئی آزاد ریاستوں کے قیام سے افریقہ کے نقشے پر فرانس اور بلجیم کے استعمار کی نشانیاں مٹ گئیں اور برطانوی استعمار کی چولیں بھی ہلنے لگیں۔

سوویت یونین نے ۱۹۶۰ء میں اقوام متحدہ کے اندر استعمار کی مخالفت اور محکوم ملکوں کی آزادی کی حمایت کا موقف تسلیم کروالیا۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں سیرالیون نے آزادی حاصل کی۔ ۶۲ء میں الجزائر، یوگنڈا، راونڈا اور بورونڈی نے اور ۶۳ء میں زنجبار نے ۶۴ء میں ٹانگانیکا سے الحاق کر کے ایک نئی حکومت تنزانیہ کی بنیاد رکھی۔ ۶۳ء ہی میں کینیا نے آزادی حاصل کی، ۶۴ء میں زمبیا اور ملاوی اور ۶۵ء میں گمبیا آزاد ہو گیا بسوانہ جو پہلے بچوانہ لینڈ تھا۔ اور لیسوتھو (بسوٹولینڈ) نے بھی ۶۶ء میں آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۶۸ء میں سوازی لینڈ اور استوائی گنی نے بھی غلامی کا جوا اتار پھینکا۔ اور آج افریقہ میں ۴۱ حکومتیں آزاد اور خود مختار ہیں۔ ان کی ریاستوں کا مجموعی رقبہ دو کروڑ ۰، لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ یہ پورے براعظم کے ۹۰ فیصد رقبہ کے برابر ہے۔ اِن آزاد ریاستوں کی کل آبادی ۳۰ کروڑ ہے۔ جو کل افریقہ کی آبادی کا ۹۲ فیصد ہے۔

لیکن افریقہ کی پیشانی سے غلامی کے داغ ابھی سب کے سب نہیں مٹے ہیں۔ جنوب میں انگولا اور موزمبیق، پرتگال کے سمندر پار صوبوں کی حیثیت سے اب تک برقرار ہیں۔ جنوبی افریقہ نے نومبیا (جنوب مغربی افریقہ) پر غیر قانونی تسلط قائم کر رکھا ہے، رہوڈیشیا میں سفید فام اقلیت نے برطانیہ سے یک طرفہ آزادی حاصل کر کے یہاں کی اکثریتی آبادی پر اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے۔ یہ پرتگالی نو آبادیاں اور نسلی بنیادوں پر قائم ہونے والی ریاستیں ہیں جن کے عوام انتہائی پر ہول فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی جدوجہد آزادی کے لئے جاری ہے،

افریقہ میں نو آبادیاتی استعمار کا نظام اتنی تیزی سے ریزہ ریزہ کیوں کر ہو گیا، اور وہ کون سے عوامل ہیں جو افریقی عوام کے حق میں اپنے آقاؤں پر نجات پانے میں خاص طور پر فیصلہ کن ثابت ہوئے؟ ۱۹۴۵ء کے بعد دراصل سب سے موثر اور فیصلہ کن طاقت نہ صرف افریقہ بلکہ ساری دنیا کے لئے جنگ عظیم میں سوویت یونین کی فتح ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی سطح پر سوشلسٹ نظام کا فروغ ہے۔ نتیجہ یہ کہ جو قومیں ایشیا اور افریقہ میں قومی آزادی کی خاطر برسرِ پیکار تھیں، وہ سب سوشلسٹ ممالک کی امداد پر بھروسہ کرنے کے قابل ہو گئیں، یہی امداد افریقیوں کی جدوجہد آزادی میں صرف دو ٹوک ثابت ہوئی۔

خود اعتمادی کی راہ پر

آزاد افریقہ کی عمر ابھی صرف دس سال ہے۔ لیکن اس مختصر دور میں رونما ہونے والی تبدیلیاں غیر معمولی بھی ہیں۔ اِن تبدیلیوں میں سب سے زیادہ اہم عوام کا اندازِ فکر ہے۔ جو کہ اپنی قسمت کے خود مالک بن رہے ہیں۔ ۶۰ء میں ایک افریقی ریاست کے ریلوے اسٹیشن پر دو نوجوان ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ "وہ کب سڑک دوبارہ تعمیر کریں گے"۔ وہ کب ہمیں ایک

افریقی اقوام کا نعرہ،

سامراج کے اقتصادی

گورکھ دھندے سے

باہر نکلو

ہوائی اڈہ تعمیر کر کے دیں گے۔" ان کا اشارہ غیر ملکی امدادی ایجنسیوں کی طرف تھا، کیونکہ آزادی کے ابتدائی زمانے میں افریقیوں کے یہاں یہ تصور بالعموم پایا جاتا تھا کہ کوئی باہر سے آکر انہیں یہ سب کچھ بنا دے گا۔ لیکن جلد ہی یہ تمام خوش فہمیاں اپنی موت آپ مر گئیں اور افریقی عوام نے اس حقیقت کو پا لیا کہ صرف اپنے ہاتھ سے اور اپنے دوستوں کی مدد اور سہارے سے وہ اپنے لئے بہترین مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ یہی پالیسی افریقی ممالک کو سوشلزم کے صحیح راستے پر گامزن کرنے کا باعث بنتی ہے۔

لینن کا مشورہ۔ محنت اور صرف محنت

تخلیق اور تعمیر کے لئے محنت ہی نہیں طریقۂ کار سے شناسائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ افریقی نوجوانوں نے لینن کے مشہور نعرے "مطالعہ ۔ مطالعہ ۔ مطالعہ ۔" کو نصب العین بنا لیا ہے۔ معاشیات اور ٹکنالوجی کے ابتدائی اور ثانوی اسکول کھلنے لگے ہیں۔ جن میں گنی کا پالی ٹکنک انسٹی ٹیوٹ قابلِ ذکر ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ہر سال نہ صرف گنی بلکہ مشرقی افریقہ کے ممالک کے سینکڑوں ماہرین کی تربیت کرتا ہے۔ آزادی کے ابتدائی برسوں میں بیشتر بینک، وزارتیں اور صنعتیں سفید اقوام کے ماہروں کی مدد سے چلائی جاتی تھیں۔ اب اس میں بھی تبدیلی آرہی ہے۔ اور نو آزاد ریاستوں میں "افریقیت" جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔

آج افریقی اقوام کا نعرہ ہے، سامراج کے اقتصادی گورکھ دھندے سے باہر نکلو۔ شاہ پسند سرمایہ داروں نے افریقہ کو سخت نا امید کیا ہے۔ اور اس کو مختلف سیاسی اکائیوں میں تقسیم کر دیا جس نے ان کی رفتار ترقی بیحد سست کر دی ہے۔

۶۲ء میں اقوام متحدہ کے ایک سو دس (۱۱۰) ارکان تھے ان میں بتیس (۳۲) افریقی تھے یعنی آزاد افریقہ تقریباً ۳۰ فیصد ووٹوں کا مالک تھا۔ لیکن ان افریقی حکومتوں نے کبھی اتحاد کا ثبوت نہیں دیا۔ مثلاً پندرہویں جنرل اسمبلی کی کانفرنس میں



...نگ مشقیں کر رہے ہیں

انہوں نے تمام معاملات میں صرف ۴ء۲۹ فیصد امور پر اتفاق کا اظہار کیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنا نقطۂ نظر اقوام متحدہ میں موثر طور پر پیش نہ کر سکے۔ جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کانفرنس میں ایک افریقی ملک کے نمائندے کے ڈائس پر پہنچتے ہی ہال تیزی سے خالی ہو گیا۔ جسے افریشیائی نمائندوں نے شدت سے محسوس کیا۔

مئی ۶۳ء میں عدیس ابابا کی اعلیٰ سطح کی کانفرنس میں افریقی اتحاد کی سمت ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا گیا۔ اس موقع پر ایک تنظیم برائے افریقی اتحاد کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کے منشور کے نکات یہ تھے افریقی ریاستوں میں اتحاد، یگانگت و استحکام۔ اور ان کی بقاء کے لئے استعماریت کے خلاف اشتراک عمل اور متحدہ دفاعی اقدامات، اقتصادی تعاون میں اضافہ کی سعی۔

عدیس ابابا کا یہ فیصلہ جو واضح انداز میں شہنشاہیت کے خلاف کردار رکھتا تھا۔ بدقسمتی سے عمل میں ناکام رہا۔ چند ارکان کے موقع پرستانہ طرزِ عمل نے مشترکہ کوششوں کو ناممکن بنا دیا، خصوصاً ملاوی اور لیسوتھو کی حکومتوں کا جنوبی افریقہ میں بڑھتا ہوا میل ملاپ تنظیم کے فیصلوں کے خلاف۔ افریقیوں کی ناراضگی کا سبب بنا۔

مذکورہ تنظیم افریقی ممالک کے اندرونی اختلافات کو خود بخود دور نہیں کر سکتی۔ لیکن اس تنظیم نے باہمی اعتماد کی فضا پیدا کر دی ہے۔ اور بہت سارے سرحدی جھگڑوں کو طے کرنے میں اس سے مدد ملی ہے۔ مثلاً مراکش اور الجزائر، کینیا اور صومالیہ۔ اور دوسرے ممالک کے اختلافات اسی تنظیم کے تحت طے ہوئے۔ اس تنظیم کے تحت بہت ساری علاقائی تنظیمیں بھی قائم ہوئیں۔ مواصلات میں توسیع کے سلسلے میں باہمی امداد کی خاطر معاہدے بھی ہوئے اور ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تنظیم نے افریقی استحکام کو بین الاقوامی پیمانے پر خصوصاً اقوام متحدہ میں بہت تقویت پہنچائی۔

افریقہ کو اپنے ماضی سے نوآبادیاتی غلامی کے اثرات ملے ہیں، اس براعظم کی تقریباً نصف سے زیادہ آبادی کی سالانہ آمدنی سو ڈالر سے بھی کم ہے۔ ۵ سے ۱۴ سال تک کی عمر کے صرف ۳۲ فیصد بچے اسکول جاتے ہیں۔ اور ۱۵ سے ۱۹ سال تک کے صرف ۸ فیصد لڑکے ہائی اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس طرح آج بھی اس کی اسّی فیصد سے زیادہ آبادی ناخواندہ ہے۔

یہ اقتصادی اور ثقافتی پسماندگی کس طرح دور ہو گی؟ افریقی ممالک اپنے تجربوں سے یہ سبق سیکھ رہے ہیں کہ صرف سوشلزم کا فروغ ان کے لیے حقیقی اقتصادی ترقی کی راہیں کھول سکتا ہے اور شہنشاہیت کے بندھنوں سے انہیں آزاد کرا سکتا ہے۔

آدمی آدمی کا استحصال نہ کرے

برزنیف کے یہ الفاظ جو انہوں نے لینن کی صد سالہ تقریبات پر کہے تھے یاد رکھیئے"۔ جدوجہد زیادہ عرصے تک محض قومی نہیں رہتی۔" اقتصادی آزادی" جسے بنیادی اہمیت حاصل ہے، زیادہ سے زیادہ اور قطعی اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ نئے ممالک ترقی کے ایسے راستوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ جو سرمایہ داری پر مبنی نہ ہوں اور جن میں آدمی کے ذریعہ آدمی کا استحصال نہ ہوتا ہو۔

بعض جگہوں پر سرمایہ داری نے ترقی پسند قوتوں کو زک پہنچانے کی کوشش کی ہے لیکن مجموعی طور پر اس جدوجہد کا توازن سرمایہ دارانہ نظام کے حق میں نہیں، حالیہ برسوں میں افریقہ کا جھکاؤ صاف طور پر بائیں بازو کی طرف رہا ہے۔ سوشلزم کی راہ پر گامزن افریقی ممالک کے گروہ میں آج متحدہ عرب جمہوریہ، الجزائر، گنی، تنزانیہ، کانگو (برازاویل)۔ سوڈان، صومالیہ اور دوسرے کئی ممالک شامل ہیں۔ اس عرصہ میں ترقی پسند ممالک کی تعداد میں ہی اضافہ نہیں ہوا۔ برازاویل کے خلاف رجعت پسندوں کی ناکام بغاوت اور گنی میں پرتگال کے بھیجے ہوئے کرایہ کے فوجیوں کا صفایا اس بات کی علامت ہیں کہ ان ملکوں میں عوامی طاقت مضبوط ہے اور سامراج کے حامی عناصر جو بالکل بے دست و پا ہیں۔ پچھلے دس برس میں افریقی ملکوں میں سرمایہ دارانہ معیشت سے بیزاری اور سوشلسٹ نظام معیشت سے بڑھتی ہوئی دلچسپی افریقی عوام کی سوچ میں بنیادی تبدیلی کا ایک واضح اظہار ہے۔

افریقی عوام اب مارکس اور اینجلز کے پیش کئے ہوئے معاشی نظریے کو جدید نوآبادیاتی استحصال اور سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے خلاف ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں براعظم افریقہ میں سوشلزم اب صرف ایک نظریہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت بن رہا ہے جس کو اپنا کر افریقی عوام اپنی صدیوں کی معاشی پسماندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کانگولیز ورکرز پارٹی نے جو کانگو کی برسر اقتدار سیاسی جماعت ہے، اعلان کیا ہے کہ وہ مارکسزم اور لینن ازم کو بطور ایک نظریے کے اپنا رہی ہے۔

قومی ملکیت کی حوصلہ افزائی

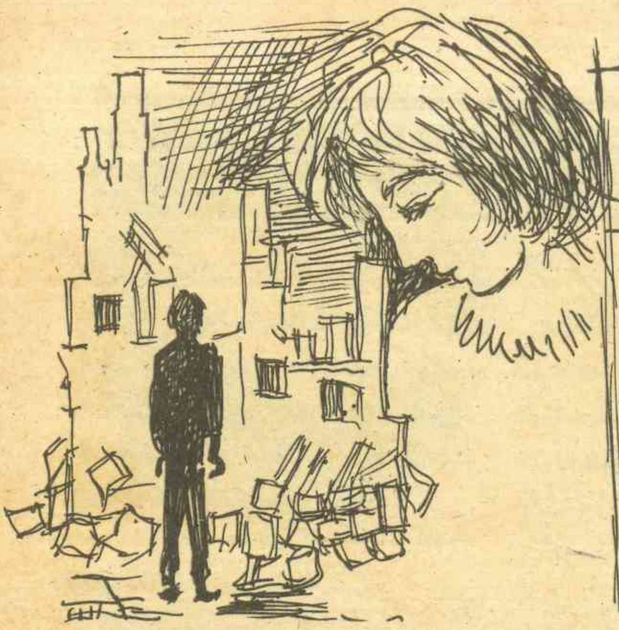
افریقہ کے وہ ملک جنہوں نے سوشلزم کو ایک معاشی نظام کے طور پر قبول کر لیا ہے، ان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر کو نئے اقتصادی نظام کی بنیاد نہ بننے دیں پرائیویٹ سیکٹر کو مکمل طور پر ختم کر دینا افریقہ کے نوآزاد ملکوں کی معیشت کے لئے موجودہ حالات میں فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے افریقی ملکوں کے رہنما پرائیویٹ سیکٹر کو مکمل طور پر ختم کرنے کی بجائے پبلک کواپریٹو سیکٹر کو زیادہ مضبوط اور موثر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مصر میں کل صنعت کا ۸۵ فیصد حصہ پبلک سیکٹر کے تحت ہے اس کے علاوہ الجیریا، سوڈان، گنی اور دوسرے ملکوں میں بھی پبلک سیکٹر تیزی سے نشوونما پا رہا ہے

دریا کے کنارے

ترجمہ: نعیم آروی

یوگوسلاویہ کا
ایک جدید افسانہ

پیتیر مالیسیویک



وہ جب گھر پہنچا تو شراب اور زندگی سے ایک بار پھر بیزار تھا۔ اس کی نیم پختہ جھونپڑی دریا کے کنارے تھی۔ اب وہ ایک طویل مدت کے لئے اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ جھونپڑی کی حالت بے حد شکستہ تھی۔ دیواروں کا پلاسٹر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ قدموں کی دھمک سے فرش پیانو کی ناہموار سطح کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ایک بڑی تقریب کی آمد سے ایک روز قبل اتوار کا دن تھا۔ سامنے والے مکان میں رہنے والے کنڈکٹر نے اس روز بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہ صاف ستھری یونیفارم پہنے تھا۔ بالوں میں اچھی طرح تیل چپڑا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف نہایت تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شخص باڑے سے بڑی عجلت میں شراب پینے کے لئے آتا، وہ انہیں لے کر کاؤنٹر تک جاتا اور پھر ان کے لئے بیئر کا ایک گلاس خریدتا۔ وہ یہ معرکے کا کام انعام کی لالچ میں کرتا تھا۔ اس سے اس کو اچھی خاصی آمدنی تھی۔ وہ بار میں آنے والے ہر شخص کو بتا رہا تھا کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنے کی فکر میں ہے۔ ہر شخص اس کے منصوبے پر اپنی پسندیدگی کے اظہار میں مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ اس تقریب کے موقع پر پکنے والے لذیذ کھانوں کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو رہی تھی۔

اسے بھوک نہیں تھی، اور نہ وہ کھانوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ سر کے نیچے تھا، آنکھیں چھت کی کڑیوں میں الجھی ہوئی تھیں، وہ اکثر اسی انداز میں گھنٹوں لیٹا رہتا تھا، اس کے فولاد جیسے بازو کبھی نہیں تھکتے تھے۔ وہ دیر تک یوں ہی سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ باورچی خانہ بہت تنگ تھا اور جلد ہی سگریٹ کے دھوئیں سے بھر گیا، سگریٹ کے دھوئیں سے آنکھیں جلنے لگیں۔ اسے یہ بات پسند تھی، عام طور پر جب وہ سگریٹ نوشی اور یک ٹک گھورتے رہنے سے تھک جاتا تو اسکی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہو جاتیں۔ وہ بڑے بھیانک اور وحشت انگیز خواب دیکھتا۔ وہ اپنی "پہلی زندگی" کے بارے میں خواب دیکھتا۔ اس نے اپنی پہلی زندگی کا یہی نام دیا تھا جب اس کے سر میں زناٹے دار گھونسے نہیں لگتے تھے اور نہ گدّی میں درد کی ٹیسیں محسوس ہوتی تھیں ایسے خواب دیکھنے کے جب وہ جاگتا تو پہلے سے زیادہ تھکن محسوس کرتا، مگر دوسرے دن کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا۔

اسکی بیوی بھی تھی، وہ اکثر و بیشتر اپنے گھر والوں سے ملنے کا بہانہ کر کے چلی جاتی۔ اور تب موسم خزاں کی بارشیں شروع ہو جاتیں، اور وہ کسی پرانی قبر کی مانند خالی ہو جاتا۔ اور اپنے جسم کو حرکت دیئے بغیر وقت کے بیشتر لمحات بلا مقصد صرف کر دیتا۔ وہ اس مرتبہ بھی چلی گئی تھی، مگر جانے سے قبل اس نے انتہائی غصے سے قسم کھائی تھی کہ "اب وہ زیادہ دیر کسی ایسے مرد کے ساتھ نہیں رہ سکتی جس میں کوئی اچھی بات ہی نہیں۔" اس معاملے میں اسے کوئی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ایسے ڈرامے اس کی زندگی میں اتنی بار اسٹیج ہو چکے تھے کہ اب اس میں کوئی جاذبیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی اس ڈرامے کے کئی موڑ باقی ہیں۔ ایک بار وہ اسی طرح سے چلی گئی تھی اور بڑے لمبے عرصے تک واپس نہیں آئی۔ اس مرتبہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں نہیں گئی، بلکہ ایک ملاح کے ساتھ رہ رہی تھی،

"اُف پہاڑ کی مانند قوی ہیکل اور سخت تھا۔"

اس نے بعد میں بڑی ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے اسے بتایا۔ ایک پاگل کر دینے والی رات میں دونوں میں ٹھن گئی۔ چھینا جھپٹی اور آپا دھاپی میں کئی گلاس ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔

اس بات سے وہ کبھی پریشان نہ ہوا کہ وہ اس طرح کی زندگی پسند کرتی تھی۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ دونوں محض ایک دوسرے کی بے پردہ اور ننگی زندگی کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان، ایک دوسرے سے قریب رہنے کا بس یہی ایک تعلق تھا۔

ایک رات، دونوں نے خوب شراب پی، نشے کی ترنگ میں وہ بڑی دیر تک اپنی سلگتی ہوئی سگریٹ سے اسکے سینے کے بال جلا کر لطف اندوز ہوتی رہی۔ وہ خاموشی سے لیٹا ہوا دیکھتا رہا۔ بال جلنے کی بدبو اس کے نتھنوں میں گھستی رہی، وہ اسکی آنکھوں میں چھوٹی چھوٹی چنگاری کے دائرے ناچتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کئی جگہ سے اس کے سینے کا گوشت جل گیا۔ مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ جس انداز میں دیوانہ وار قہقہہ لگائے گی، اسے برداشت کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس رات، اس کے ہاتھ جو کچھ آیا سلامت نہ بچا، کمرے کی ہر چیز توڑ پھوڑ کے برابر کر دی۔ اس کے بعد اس کا موڈ بیحد ایک بڑا خوشگوار ہو گیا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی سے راہ گیروں کے چہرے بھیگ رہے تھے۔ آسمان کا رنگ بھورا تھا، بالکل ان مکانوں کی طرح، جدھر سے وہ ابھی ابھی گذر رہا تھا، وہ اپنے ایک دوست کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا جو اسی جیسا گلاسوں کی آواز کا رسیا تھا۔ دونوں نے کئی بار کانچ کی چوڑیوں کی طرح رنگین شامیں اکٹھے گزاری تھیں۔

وہ پہلی بار اسے بار میں ملی تھی۔ بار کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو وہ دوسری میز پر چند کلرکوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی شراب پی رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سب ایک ہی میز پر اکٹھے ہو گئے۔ اس نے کنگھی سے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوار لیا تھا۔ وہ اسکی اس حرکت پر ہولے سے مسکرائی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کی۔ مگر نہ جانے کس طرح وہ بے

موسم خزاں کی بارشیں شروع ہوجاتیں اور وہ کسی پرانی قبر کی مانند خالی ہوجاتا

قابو ہوگیا۔ بڑی دیر تک وہ دونوں رقص گاہ میں رقص کرتے رہے۔ دوسرے لوگ چیختے چلاتے گیت گاتے، دریا کے کنارے باڑے کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ رقص کے دوران اس نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ لیکن تمہارے ساتھ چلنے سے پہلے، میں اس ڈاکیئے کو بتا دینا چاہتی ہوں جس سے میں بے پناہ محبت کرتی ہوں۔"

اس کے بعد وہ دونوں گھر آگئے۔ اسکی چھاتیوں کی مخروطی گولائی پر وہ لٹو ہوگیا۔ اسے اپنے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے جذبات پر قابو رکھنا بڑا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اس نے بڑی نرمی سے اس کے شعلہ فشاں جذبات پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کہا۔ "آدمی بنو۔" اس نے بڑی بے چارگی سے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ اس کے سر کے قریب گندھے ہوئے آٹے کا ڈھیر جمع تھا۔ بالآخر دونوں ایک دوسرے کے قریب لیٹ گئے۔ بستر تنگ تھا۔ اس کے سخت اور بے چین کر دینے والے جسم کے لمس سے وہ جاگتا رہا۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ دونوں جاگ رہے تھے، کمرہ فرش کی سطح بے رنگ و روغن کی دیواریں، پورا گھر نشے میں مست جاگ رہا تھا، پھر دھیرے دھیرے ان سب پر نیند اور مدہوشی کا غلبہ بڑھتا گیا، خاموشی بڑھتی گئی، اور پھر سب سو گئے، تاریکی میں جسم تیرتے رہے۔

وہ دونوں بہت لمبے عرصے سے ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ اس کا یہی خیال تھا۔ اسکی زندگی میں بھی عام انسانوں کی طرح سیاہ اور روشن پہلو تھے۔ اسکی پوری زندگی "پہلی زندگی" کی آرزو میں ایک چیخ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی "پہلی زندگی" سے بے پناہ محبت کرتا اور اس سے خوفزدہ بھی تھا۔ جب کبھی وہ اس کے بارے میں باتیں کرتا تو وہ خاموشی سے اسٹول پر بیٹھی ہوئی بڑے غور سے اسکی باتیں سنتی رہتی۔ وہ اسے بتاتا کہ میری پہلی شریک زندگی ایک شہری عورت تھی۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ مجھے اسکی رفاقت میں شہر کے روشن دماغ لوگوں سے ملاقات کا موقع ملتا تھا۔"

یہ باتیں وہ بہت دھیان سے سنتی کیونکہ اس کی باتوں میں بڑا مزہ ملتا۔ گو وہ ان باتوں کو بہت کم سمجھ پاتی۔ بعد میں وہ اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر کے ناطقہ بند کر دیتی۔ بعض اوقات وہ اس کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے پاگل ہو جاتا۔ مگر ایک مرتبہ جب وہ اپنی پہلی زندگی کے قصے سنا کر خاموش ہوا تو اس نے اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ اس کا چہرہ غم میں ڈوبا ہوا تھا، پھر دھیرے دھیرے اس پر سختی اور کرختگی کے اثرات نمایاں ہوتے چلے گئے۔

دوسرے ہی دن وہ اس عورت سے ملنے کے لئے شہر روانہ ہوگئی۔ شہر میں بہت دنوں تک وہ اس بات سے پریشان رہی کہ جب وہ راہ چلتی تو اس پر چاروں طرف سے دباؤ ڈالا جاتا۔ یہاں تک کہ اسکی سانسیں الجھنے لگیتیں، مگر اس نے ہمت نہ ہاری، اور مضبوط ارادے کے ساتھ اس عورت کو تلاش کرتی رہی، اور بالآخر اسکی ملاقات، شہر کی اس نفیس خاتون سے ہوگئی، لنچ ٹائم تھا۔ ہوٹل جگمگا رہا تھا۔ اندر گھسنے کی کوشش میں بیروں کی نظر اس پر پڑگئی۔ اسے بڑی نفرت اور حقارت سے ہوٹل سے باہر کر دیا گیا۔ جب شہر کی سڑکوں پر پھیلے ہوئے سائے لمبے ہوگئے اور بڑی بڑی خوبصورت دکانوں کے رنگین قمقمے روشن ہوگئے تو وہ اس عورت کے گھر پہنچ گئی۔ اسے اندر جانے نہ دیا گیا، مگر وہ ڈٹی رہی، اور آخرکار اس کی ضد کے آگے انہیں ہتھیار ڈالنا پڑا۔ بڑے شہر کی پروقار اور معزز خاتون بڑی تمکنت سے سگریٹیں پھونک رہی تھی۔ اور بے سبب چیخ چلا رہی تھی۔

اس کی پوری زندگی "پہلی زندگی" کی آرزو میں ایک چیخ بن کر رہ گئی تھی"

اسے پہننے کے لئے نفیس لباس دیا گیا۔ اور واپسی کے لئے کرایہ بھی۔ پہلے پہل تو مرد بہت ناراض ہوا۔ مگر اس کے بعد یکایک وہ نرم پڑگیا۔ اور اسے کرید کرید کر وہاں کی تفصیلات پوچھتا رہا۔ اس کے بعد وہ بیمار ہوگئی۔ بیماری میں اسے تکلیف کا کوئی احساس تک نہ ہوا۔ وہ یہ بھی فراموش کر چکی تھی کہ بڑے شہر میں وہ سیاہ روغنی چہرے والے قفل ساز کے ساتھ سوئی تھی۔

وہ شہر میں گھومنے کے بعد ایک بار پھر واپس لوٹ آئی تھی۔

اس بات پر وہ بے حد خوش تھا۔ وہ بہت عرصے سے اپنے جذبات میں یکسانیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ کسی ایسی بات کا متوقع تھا۔ جس سے اس کے اندر کوئی تبدیلی رونما ہو، اس کے اچانک آجانے سے اس کے اندر تبدیلی محسوس ہوئی۔ اس کے سر میں دوبارہ زناٹے دار گھونے لگنے۔ پہلے اس نے بستر کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے بلب کو توڑ دیا۔ جس کی چمک اس کی آنکھوں کو ناگوار گذر رہی تھی۔ اس نے کبھی تیز روشنی پسند نہیں کی۔ بلب کے اندر سے سرخ اور پیلے رنگ کی لپلپاتی ہوئی زبانیں۔ اس نے انتہائی طیش میں اس کے بالوں کو مٹھی میں بھر کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "ہماری تمہاری زندگی کتنی بے مقصد ہے۔" وہ بالکل خاموش رہی۔ بت کی مانند ساکت و جامد، تکلیف کے ہر احساس سے خالی، دریا کے کنارے جھونپڑی خاموش تھی۔ مگر اس بار جھونپڑی بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ ٹوٹے ہوئے بلب کی روشنی میں اس کے حلق سے بے ہنگم اور بے معنی آواز نکلی وہ بے آواز چلتی ہوئی، ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ اسی طرح چپ چاپ، خاموش اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ اور کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہی، پھر اپنے آپ آپ کو پانی میں گرا دیا۔ اس کے بعد وہ کبھی واپس نہ آئی۔

وہ کمرے میں لیٹا ہوا تھا، اس کی آنکھیں چھت کی کڑیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ اسے یکایک کمرے کے باہر اس کے قدموں کی مانوس چاپ سنائی دی۔ "ہاں۔ ہاں۔ یہ اسی کے بے ہنگم قدموں کی چاپ ہے۔ وہ شاید پھر آگئی۔" اس نے اپنے کان آواز پر لگا دیئے بس ایک لمحہ کے لئے اس کے جذبات میں ہیجان برپا ہوا اور پھر ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر اکتاہٹ اور بے زاری کی پرچھائیاں رینگ آئیں۔ ہمیشہ کی طرح ایک پرانے واہمہ نے پھر اسے دھوکا دیا تھا خوشی اس سے کوسوں دور تھی۔ باہر کہیں کسی مرغے نے اذان دی تھی۔ سو کمرے میں داخل ہوئی۔ اور چپکے سے اپنا لباس اتار کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ اس کے جسم سے بھینی بھینی خوشبو کی مانوس لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ عورت کے جسم کی یہ خوشبو مرد کو کتنا قریب کر دیتی ہے اس کے جذبات بھڑکتے جا رہے تھے۔ لالٹین کے سوراخ سے گہرے دھوئیں کی لکیریں باہر نکل رہی تھیں۔ اس نے اس کے جسم کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ باہر مرغے نے پھر بانگ دی۔ اور خاموش ہوگیا۔



مسلم لیگ تحریک سے شناسائی کی ایک کوشش

از - پیام شاہجہان پوری

صفحات - ۴۶۰

ناشر - انجمن حمایت اسلام - لاہور

یہ تاریخ اُن واقعات، رجحانات اور حالات کی ہے، جو ۱۸۵۷ء کے بعد سے برصغیر میں ظہور پذیر ہوتے رہے اور بالآخر پاکستان کے قیام پر منتج ہوئے، اس لحاظ سے اس میں نہ صرف مسلم لیگ کی تاریخ سمٹ آتی ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی دوسری تحریکوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ میں سرسید کی کاوشیں سید تحریک کے زیر اثر مسلمان مصلحین کی آمد، مسلم لیگ کا قیام، خلاف تحریک کا جوش و خروش، کانگریس اور فرقہ پرست جماعتوں کے مقابل میں مسلمانوں کی صف بندی، قرارداد پاکستان کی منظوری، اس سے پہلے نیشلسٹ مسلمانوں کے سیاسی افکار و عقائد کا اجمالی تذکرہ غرضیکہ یہ تصنیف پچھلے سو برس کی ایک مکمل تاریخ ہے۔

نظریۂ پاکستان کی اصطلاح ویسے ترمحلِ نظر ہے کہ نہ قائد اعظم نے اور نہ ان کے کسی معتمد نے ایسی کوئی اصطلاح، تحریک قیام پاکستان کے دور میں استعمال کی، کیونکہ "نظریے" کی بنیاد پر پاکستان کی مخالفت پہلے ہی بڑی شدت کے ساتھ ہو رہی تھی اور مسلم لیگی زعمائیہ نہیں چاہتے تھے کہ نظریے کے باب میں کوئی ایسی بات ان کے زبان یا قلم سے نکل جائے جو خود ان کی صفوں میں تفرقے کی موجب ہوسکتی تھی، تاہم اگر یہ کہا جائے کہ تحریک پاکستان کا مقصد غیرمسلم اکثریت کی بالادستی سے نجات حاصل کرتے ہوئے مسلم اکثریت کے علاقوں کی ایک جداگانہ ریاست قائم کرنا تھا" یہ نظریہ یقیناً درست ہے۔ اس کے برعکس رجعت پرست عناصر نے، اپنے مفروضوں کی تائید کیلئے "نظریۂ پاکستان" کی اصطلاح فی زمانہ نہایت فراخدلی سے استعمال کی ہے۔ یہاں تک وہ لوگ جو اس تحریک کے ہی سرے سے مخالف تھے۔ اب "نظریۂ پاکستان" کے سب سے بڑے محافظ بن بیٹھے ہیں۔ جناب مصنف نے تاریخی واقعات اور شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے مخالف عناصر کی نشاندہی کردی ہے چنانچہ وہ "اسلام پسند" حضرات، جو نہایت کاوش کے ساتھ اپنے "پاکستان دشمن" ماضی پر پردہ ڈالنے میں مصروف تھے، کتاب کے ان مندرجات سے کسی قدر مایوس ہوئے ہیں۔ لیکن یہ تو جیتی جاگتی اور محض چند روزہ پرانی تاریخ ہے۔ اسے کوئی کس طرح جھٹلا سکتا ہے۔

برصغیر کی سیاسی تاریخ، اعلان آزادی کے بعد سے بہ کثرت لکھی گئی ہے۔ ان میں ہندوستان کے مشہور مورخوں کی بعض قیمتی دستاویزات بھی شامل ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف "انڈیا ونز فریڈم" حالیہ دور کی غالباً سب سے اہم اور متنازعہ دستاویز ہے

افسوس کہ ہمارے یہاں مبسوط اور مستند تاریخی دستاویزات کی تدوین کا کام صحیح معنوں میں اب تک نہیں ہوا۔ کراچی یونیورسٹی میں بعض ذی علم حضرات کے اشتراک و تعاون سے مسلم لیگ کے پرانے کاغذات کوڑے کے انبار سے نکال کر تحریک پاکستان کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جو یقیناً ایک قابل قدر کام ہے۔ تاہم ہمارے پاس اس وقت جو کتابیں موجود ہیں ان میں جناب پیام شاہجہانپوری کی تالیف بہرحال ایک قابل قدر کوشش ہے۔

رُت کی پکار

مصنف - احسان ملک

قیمت - پانچ روپے

پبلیشرز - تخلیق مرکز - ۲۳ اے

شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

"رُت کی پکار" نوجوان افسانہ نگار احسان ملک کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں جو فن اور ٹیکنک کے اعتبار سے بالعموم کامیاب اور اثر انگیز ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ "احسان ملک کے افسانے مروجہ تمدنی اور معاشی نظام کی چیرہ دستیوں کے خلاف فنکارانہ احتجاج ہیں۔ وہ ان افسانوں میں جبر و ستم کی کچھ اس انداز سے نشاندہی کرتے ہیں کہ قاری نہ صرف ظلم اور زیادتی کا سراغ پالیتا ہے بلکہ اس دل میں اس سفاکی سے گلو خلاصی حاصل کرنے کا جذبہ بھی بیدار ہو جاتا ہے۔"

کچھ اور آگے چل کر احمد ندیم قاسمی احسان ملک کے فن کے بارے میں بڑے فنکارانہ انداز سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ "ان کا مقصد کہانی کی فضا میں ڈھنڈورا نہیں پیٹتا، سرگوشی کرتا چلا جاتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں سرگوشی بھی نہیں کرتا، قاری کے دل و دماغ میں نفوذ کر جاتا ہے۔"

فنکار معاشرے کا ایک حساس، ذہین اور بالغ نظر حصہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش پر ایک عام آدمی سے کہیں زیادہ گہری اور تنقیدی نظر رکھتا ہے اور وہ جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، من و عن قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ فنکار کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے، اور وہ اپنے مقصد کو فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ کچھ اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ الفاظ جیتی جاگتی زندگی کا روپ دھار لیتے ہیں۔ مقصدیت کے خلاف رجعت پسندوں کا گروہ عرصۂ دراز سے صف آرا ہے کہ "مقصدی ادب، ادب نہیں پروپگنڈا ہوتا ہے" اس کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا گیا ہے کہ مقصدیت کو برتنے والا صحیح معنوں میں فنکار ہو تو مقصد افسانے کو آلودہ نہیں کرتا، اُسے نکھارتا سنوارتا اور دمکاتا ہے۔

احسان ملک کے افسانے بھی مقصدی افسانے ہیں۔ زندگی سے اتنے قریب کے بعض اوقات ان پر حقیقی اور بامعنی زندگی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ان کا فن زندگی سے یوں بھی قریب ہے کہ انہیں اپنے پیشے ورانہ زندگی کی وجہ سے پنجاب کے دیہاتوں میں رہنے کا موقع ملا اور دیہی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

"جھومتی ہوئی یہ فصل لہرا کے اٹھی اور شیر جیسے جوانوں کی چمکتی لشکارتی درانتیوں پر رقص کرنے لگی۔ کئی دنوں تک گاؤں والوں نے وہی رقص دیکھا۔ وہی فصل دیکھی، وہی درانتیاں دیکھیں، وہی شاہیا دیکھا۔ اور جب ہر چند شام کی روشنی میں لال کلال ہو رہی تھی۔ تو گاؤں نے اس بھیگی شام میں دیکھا کہ شاہیا، تھک کر گر پڑا ہے۔ جوان تھک کر گر پڑے ہیں۔ درانتیاں تھک کر گر پڑی ہیں۔ اور ساری فصل تھک کر گر پڑی ہے۔"

زیر نظر افسانوں میں "سنہری زندگی" معاشرے کی اعلیٰ سوسائٹی اور اس کی جھوٹی چمک دمک پر گہرا طنز ہے۔ ادیب کرداروں کی کھوکھلی زندگی سے پردہ اٹھا کر انہیں ان کے اصل روپ میں ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ بعض افسانوں میں مصنف نے اپنے کرداروں کی تعمیر میں تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے مختصر اظہار کے ذریعہ ان میں رنگ بھر دیا ہے۔ "رُت کی پکار" موضوع کے اعتبار سے ایک خالص رومانی افسانہ ہے، افسانے کے پورے ماحول پر رومانی فضا طاری ہے۔ اسی طرح دوسرے افسانے بھی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مصنف کے افسانوی اسلوب دلچسپ ہے تمام کے تمام افسانے ذہن پر گہرا تاثر چھوڑتے ہیں۔

طباعت اور کتابت صاف ستھری اور دیدہ زیب ہے

ہر گھر کی کہانی

کتاب کا نام :- مجھ کو چاہیئے بہار

مصنف :- سیّد علی

قیمت :- ۲ روپے

پبلشرز :-

نگارستان پبلشرز پاکستان چوک کراچی۔

ناول "مجھ کو چاہیئے بہار" کی ابتدا میں کچھ لوگوں کی رائے درج کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ یہ ناول تقریباً ہر گھر کی کہانی ہے۔ اور موجودہ معاشرے کے اس المناک پہلو کو اُجاگر کرنے کے لئے لکھا گیا ہے جس سے ہماری سماجی زندگی درہم برہم ہوتی جا رہی ہے۔ اس ناول کی کہانی جب اپنے آخری حصّے کو پہنچتی ہے تو اس رائے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ واقعتاً مصنّف کے پیشِ نظر زندگی کے کچھ تلخ حقائق تھے جسے اُس نے اس کتاب کی صورت میں پیش کر دیا۔ "آج کی دُنیا میں ہر شخص قیمتی چیزوں کی طرف بھاگ رہا ہے، اچھا لباس، عمدہ کوٹھی اور قیمتی کار، اس دوڑ میں حلال اور حرام کا فرق مٹ گیا ہے۔" ممکن ہے کہ یہ بات جبکہ ناول کا فن، ٹیکنک اور موضوع کے اعتبار سے خاصا ترقی کر چکا ہے، گھسی پٹی اور فرسودہ معلوم ہو مگر اس کی سچائی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ موجودہ سماجی زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ ہر فرد بہتر اور اعلیٰ زندگی کی لالچ میں زندگی کی بعض اچھی قدروں کو روندتا اور کچلتا ہوا سرپٹ بھاگ رہا ہے۔

اس ناول کی دوسری بڑی خوبی اس کی ٹیکنک ہے۔ یہ ٹیکنک فلمی اسکرین اور ناول کی ملی جلی ٹیکنک ہے اس ٹیکنک پر بہت کم ناول لکھے گئے ہیں مصنّف نے اس طرح ناول اور فلم کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ کتاب کی طباعت اور کتابت کو گوارا کہا جا سکتا ہے۔

گلدستۂ عقیدت

از - صابر تھاریانی

صفحات - ۴۳۹

قیمت ۴ روپے

ملنے کا پتہ - آغوش ادب، ۲۲ ڈی رضویہ کالونی کراچی ۱۸

جیبی سائز کی یہ مستطیل بیاض، جو سفید کاغذ پر مضبوط جلد کے ساتھ قارئین کی نذر کی گئی ہے - اہل بیتؑ کی مدحت کے باب میں شاعر کے قطعات کا مجموعہ ہے، نسیم امروہوی صاحب، جو ہمارے زمانے کے نامور قصیدہ گو شاعر ہیں، تھاریانی صاحب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ بلاشبہ "اردو زبان کے بھی اچھے شاعر ہیں" دراصل اس "بھی" کا محل یوں پیدا ہوا کہ تھاریانی صاحب انگریزی اور گجراتی میں بھی شعر کہتے ہیں اور روایت ہے کہ نامور ہجانی فخر ماتری مرحوم نے انہیں گجراتی کا "صاحب طرز شاعر" تسلیم کیا تھا۔

اس مجموعے کو محض اس لئے "رعایتی بنیاد" پر سراہنے کی ضرورت نہیں کہ اوّل تو گلدستۂ عقیدت ہے۔ دوسرے مصنّف ایک "غیر اہل زبان" شاعر ہے۔ بلکہ اپنے شعری محاسن کی بنا پر یہ قطعات پسند کئے جائیں گے۔

تمہارے اِک اشارے پر کہاں سے وہ کہاں پہنچے
کرے سارے جہاں کو محوِ حیرت، وہ جہاں پہنچے
درِ حُبّت کے سجدوں کے لئے تڑپے جو پیشانی
تو مولا کے کرم سے خود جبیں تک آستاں پہنچے

نام رکھنے کی بھی اجازت نہیں

ہینز جارج اور ماریا ٹریز نے ارڈنگ کے ایک چھوٹے سے شہر بادیرین میں جب اپنے نومولود بچّے کا نام سرکاری طور پر رجسٹر کرانے کے لئے درخواست پیش کی تو محکمہ کا پورا عملہ حیرت اور مُسرت کے ملے جُلے تاثرات میں ڈوب گیا۔ رجسٹرار نے انہیں بتایا کہ "اس کی ۲۷ سالہ مدّت ملازمت میں یہ پہلا، انوکھا اور ناقابلِ یقین واقعہ ہے جب کسی والدین نے اپنے لڑکے کا نام "چی" (ابولیویا کا انقلابی رہنما) رکھا ہو۔ اس نے مزید کہا" کہ اس نام سے بچّے کی جنس کی نشاندہی نہیں ہوتی"۔ رجسٹرار نے جرمن قوانین کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے بچّے کا نام مُسترد کر دیا۔

جرمن والدین نے بچّے کی جنس کے متعلق غلط فہمی دُور کرنے کے لئے بچّے کا پورا نام چی۔ مائیکل رکھا اور دوبارہ رجسٹریشن کی کوشش کی، مگر رجسٹرار نے اس بار بھی بچّے کا نام رجسٹر کرنے سے انکار کر دیا۔ بچّے کے والدین محکمہ کی اس بے انصافی پر بہت ناراض ہوئے اور بالآخر عدالت سے رجوع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہینز جارج برقیات کا مستری ہے، اس کا کہنا ہے کہ "میں نظریات کے خلاف ہوں۔ چی ایک انسان تھا، اور بحیثیت انسان اس نے ہمیں متاثر کیا ہے۔ اس نے غربت اور ناانصافی کے خلاف اور ایک انقلابی معاشرے کی تعمیر کے لئے دُنیا کی تمام آرام و آسائش کو تج دیا اور اپنے آپ کو غریبوں کی بہتری کے لئے وقف کر دیا اور آخر کار اُسے اپنی اس انقلابی سوچ اور انقلابی عمل کی خاطر اپنے آپ کو بھی قربان کرنا پڑا۔"

جرمن کے یہ قابلِ رشک والدین گو دو نچلی عدالتوں میں ناکام ہو چکے ہیں پھر بھی ان کا حوصلہ بلند ہے، اور اب وہ ہائیکورٹ میں اپیل کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، خیال ہے، اس مرحلے میں تقریباً ۲ سال لگ جائیں گے۔ اگلے ہفتے وہ اپنے بچّے کی پہلی سالگرہ منانے والے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک اپنے بچّے کا کوئی دوسرا نام نہیں رکھا ہے۔ بچّے کی ماں مغموم ہے، پریشان نہیں، اس کا کہنا ہے کہ "میرے بچّے پر 'چی' کے نام کا یہ اثر ہوگا کہ وہ اپنی زندگی دُکھی انسانوں کی خدمت اور ان کے لئے ایک نئی جنّت کی تعمیر میں وقف کر دے گا۔"

سب سے پُرانا ٹیکس

برطانوی شہری لنکن شائر کے پُرانے محل نلنگھم پیس کی مرمت کے لئے ۳۰۰ برس سے ٹیکس ادا کرتے آئے ہیں اور اب تک ادا کر رہے ہیں، حالانکہ اس نام کی کسی عمارت کا کوئی وجود نہیں شاہ چارلس نے یہ محل "ایجاد" کیا تھا، تاکہ اس کی "مرمت" کا بہانہ کر کے شہریوں سے قانونی طور پر ٹیکس وصول کر سکے۔ اس طرح شاہ چارلس کو ۵۰ پونڈ ۱۰ شلنگ کی سالانہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ یہ رسم آج تک جاری ہے، البتہ اب اس مد میں وصول ہونے والی رقم لنکن شائر کی کاؤنٹی کونسل کے خزانے میں چلی جاتی ہے۔

دفاتر میں حادثے

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دفاتر کے مقابلے میں سڑکوں پر اور گلی کوچوں میں حادثے کا خطرہ زیادہ رہتا ہے، لیکن امریکہ میں اعداد و شمار سے اس کی تردید ہو گئی ہے۔ وژن (VISION) میگزین نے لکھا ہے کہ امریکہ کے دفاتر میں ہر سال تین سو سے لے کر چار سو تک افراد ہلاک ہو جاتے ہیں، زخمیوں کی تعداد بھی ساٹھ ہزار اور اسّی ہزار کے درمیان ہے۔ ان حادثوں کے اسباب مختلف ہیں۔ مثلاً پھسلواں فرش، فرش پر گری ہوئی کافی، بیچ راستے میں رکھی ہوئی ردّی کی ٹوکری، اور قینچی یا دوسرے آلات کا لاپرواہی سے استعمال۔ عورتوں کے زخمی اور ہلاک ہونے کی تعداد مردوں کے مقابلے میں دگنی ہے۔

مزدور کیا چاہتے ہیں؟

۱- کم از کم تنخواہ دو سو روپے ہو اسی تناسب سے ہنر مند مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔

۲- گرانی ختم کی جائے۔

۳- مزدوروں کو ہڑتال کا غیر مشروط حق دیا جائے۔

۴- تمام گرفتار مزدور لیڈر طالب علموں اور سیاسی لیڈروں کو رہا کیا جائے اور ان کے مطالبات پورے کئے جائیں۔

جنرل سکریٹری - ویسٹ پاکستان
ٹرانسپورٹ سروس - حیدر آباد

پشاور میں

مکانوں کا مسئلہ

۱۰۰ روپے کے ملازم کے لئے

۱۵۰ روپے ماہانہ کرایے کا مکان۔

۷۰ فیصد شہری عذاب میں مبتلا ہے۔

بنگلے نہیں چاہئیں۔ کوارٹر بنوائیے۔

سروے: مرتبہ تنظیم الخدمت پشاور

پشاور کے ایک پرانے محلّے کا ایک بوسیدہ مکان

صنعت و حرفت اور تجارت کی روزافزوں ترقی کی وجہ سے شہری کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ غیر زراعت پیشہ لوگ دیہات کو چھوڑ کر شہروں میں آباد ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ دیہات کے مقابلہ میں شہروں میں روزگار پیدا کرنے کے وسائل زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔

آبادی میں اضافے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن میں ایک مسئلہ "رہائشی مکانات کا ہے"۔ پاکستان کی آبادی میں گذشتہ چند برسوں سے جس برق رفتاری سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس تیزی سے عام شہریوں کے لئے رہائشی ضروریات پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق آبادی میں اضافے کے سبب ہر سال تقریباً پانچ لاکھ نئے خاندانوں کے لئے نئے گھروں کی ضرورت پڑتی ہے حکومت نے بعض علاقوں میں رہائشی مکانات کی سہولتیں مہیا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن پشاور، جو پاکستان کا صنعتی لحاظ سے ایک پسماندہ علاقہ ہے آج تک اس علاقے کے مسائل پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ نتیجتاً آج پشاور کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔

پشاور کی اکثر آبادی دستکاروں، معمولی تاجروں، چند بڑے سوداگروں اور سرکاری و غیر سرکاری ملازمین پر مشتمل ہے۔ یہاں چونکہ کوئی بڑے بڑے کارخانے اور صنعتی ادارے نہیں اس لئے لوگوں کی عام مالی حالت بھی اچھی نہیں نئے مکانات کی تعمیر کے لئے زمین آسانی سے ہاتھ نہیں آتی اور تعمیراتی سامان کی قیمتیں بھی بہت زیادہ ہو چکی ہیں اس لئے قدیم شہر کی عمارات پرانی اور بوسیدہ ہیں۔ اور ان میں سے اکثر حفظانِ صحت کے تقاضوں کو بھی پورا نہیں کرتی۔ اس سلسلے میں کریم پورہ اندر شہر اور جوگن شاہ کے علاقوں کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ ان علاقوں میں بعض گلیوں کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں ہے اور اکثر عمارات چار چار اور پانچ پانچ منزلوں پر مشتمل ہیں اور آمنے سامنے کے مکان اوپر جا کر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ جس سے نچلی منزلوں اور گلیوں میں روشنی اور دھوپ کا گذر تک نہیں ہوتا۔ سارا دن بجلی کی روشنی میں کام کرنا پڑتا ہے گلی کوچوں میں جابجا کوڑے کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے شہر کے لوگ مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً تپ دق، دمہ، ملیریا، ہیضہ وغیرہ۔

سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد پشاور کی آبادی میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی آبادی کے مقابلے میں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں پشاور کی آبادی میں اوسطاً ۲۵ء۳ فیصد سالانہ اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ اب جب کہ ۱۹۷۱ء میں مردم شماری ہونے والی ہے۔ یہ اضافہ ۱۹۶۱ء کے مقابلہ میں تقریباً ۳۳ فی صد متوقع ہے یعنی ۱۹۵۱ء میں جہاں ۱۰۰ آدمی رہائش پذیر تھے۔ اب وہاں تقریباً ۱۷۷ آدمی رہ رہے ہیں۔ آبادی میں اضافے کی اس رفتار کے مقابلے میں اگر رہائشی مکانات کی سہولتوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بہت ہی قلیل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پشاور کی تقریباً ۶۹ فیصد آبادی رہائشی مسئلوں سے دوچار ہے۔ رہائشی مکانات کی قلت اور بے گھر لوگوں کی رہائشی ضروریات میں اضافہ کی وجہ سے مکانوں کے کرائے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک معمولی "سی" قسم کے مکان کا کرایہ پچاس روپے تا اسی روپے سے کم نہیں۔ ملازم پیشہ جس کی ماہانہ آمدنی ۱۰۰ روپے اور ۲۰۰ روپے کے درمیان ہو۔ اس کرائے کا بوجھ کیسے برداشت کرے گا۔ یا ایک معمولی دوکاندار یہ رقم کیسے ادا کر پائے گا۔ یہ اونچے کرائے غریب عوام کے لئے ناقابلِ برداشت عذاب بن گئے ہیں۔ اور ان کے لئے سر چھپانا پیٹ بھرنے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔

پشاور میں دوسرے شہریوں کی طرح حکومت کے درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین بھی رہائشی مکانوں کے مسائل سے دوچار ہیں حکومت کی طرف سے اب تک ان ملازمین میں بمشکل ۷ فیصد کو رہائشی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ جب کہ تقریباً ۹۳ فیصد کو ان کی تنخواہ کا ½ فیصد بطور کرایہ دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ خود کرایہ پر رہائشگاہ حاصل کر سکیں۔ حکومت کے ان ملازمین کی تنخواہ ۸۰/- روپے اور ۳۵۰/- روپے کے درمیان ہے۔ یعنی ان ملازمین کو حکومت کی

کیا انتظامیہ سیٹلائٹ ٹاؤن کے پلاٹ امراء میں تقسیم کر دینا چاہتی ہے؟

طرف سے کرایہ مکان تقریباً ۲۰/- روپے اور ۳۰/- روپے کے درمیان ملتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں ایک ایسا مکان جس میں ایک سفید پوش خاندان رہ سکے ۲۰/- روپے اور ۳۰ روپے کے درمیان ملنا خواب کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے ان تنگ دست ملازمین کو اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ کرایہ مکان کی صورت میں خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح یہ مزید تنگدستی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حکومت اپنے جن ملازمین کو جو مکانات مہیا کرتی ہے۔ ان میں سے اکثر مکان انسانوں کی رہائش کے قابل نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں ریلوے کے ملازمین کے کوارٹر بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ایک جائزے کے مطابق پشاور کے بعض مکانات میں دو دو اور تین تین کنبے آباد ہیں۔ یہ وہ غریب اور مصیبت زدہ لوگ ہیں جو ایک علیحدہ مکان کرایہ پر حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ کئی کنبے مل کر ایک مکان کرایہ پر حاصل کر لیتے ہیں۔ اور کرایہ کی رقم کا اپنا اپنا حصّہ مقرر کر کے ہر ماہ مالک مکان کو ادا کر دیتے ہیں۔ ان میں ہر کنبہ ایک چھوٹے سے کمرے میں زندگی کے روز و شب پورے کرتا ہے۔ اس طرح تنگ جگہ پر رہنے سے اکثر افراد تپ دق اور کئی دوسرے موذی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مالی مشکلات کی وجہ سے علاج نہیں کروا سکتے اور آخر کار موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ٹاؤن بلڈنگ کمیٹی کے فیصلے

"رہائشی مکانوں کی قلت" پشاور کا بہت پرانا اور سنگین مسئلہ ہے۔ اس لئے اس کی شدت کا احساس حکومت کو بھی ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں کمشنر شیر فضل خان کی سربراہی میں ایک ٹاؤن بلڈنگ کمیٹی تشکیل دی گئی اور فیصلہ ہوا کہ شہر سے باہر ایک نئی بستی تعمیر کر کے رہائشی مکانوں کے مسئلہ کو حل کیا جائے۔ کچھ کاغذی کارروائیاں ہوئیں لیکن تین سال تک یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اسی دوران شیر فضل خان پشاور سے تبدیل ہو کر چلے گئے۔ اور ۱۹۶۶ء میں جب وہ دوسری بار پشاور ڈویژن کے کمشنر مقرر ہو کر آئے تو مسئلہ جوں کا توں تھا۔ مزید ایک سال تک وہ اس منصوبے کی تفصیلات مکمل کر سکے۔ ۹ اگست ۱۹۶۷ء کو ان کی زیر صدارت جب "ٹاؤن بلڈنگ کمیٹی" کا اجلاس ہوا تو کئی اہم فیصلے کئے گئے۔ نئی بستی کے لئے کوہاٹ روڈ پر دو سو ایکڑ کا رقبہ منتخب کر لیا گیا جس میں پندرہ ہزار کوارٹر تعمیر ہونے تھے۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ چودہ لاکھ روپے اس منصوبہ پر اسی سال خرچ کئے جائیں گے اور اس بستی کی تعمیر تیسرے پنجسالہ منصوبے کے دوران مکمل کر لی جائے گی۔ اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ نئی بستی کے رقبہ کو پلاٹوں میں تقسیم کر کے بے گھر لوگوں کو قسطوں کی صورت میں دیئے جائیں گے اور ضرورت مندوں کو مکانات کی تعمیر کے لئے قرضوں کی سہولت بھی مہیّا کی جائے گی۔

کمشنر صاحب نے "ٹاؤن بلڈنگ کمیٹی" کے ارکان کو جن میں اس وقت کے معززین شہر بھی شامل تھے۔ اس بات پر زور دیا کہ یہ منصوبہ جلد از جلد مکمّل کیا جائے لیکن نہ جانے کن عناصر نے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے سے روک دیا۔ مجوزہ بستی کے متعلّق کئے گئے فیصلوں کو تین سال ہو چکے ہیں لیکن افسوس صد افسوس کہ اس منصوبے کو اور بھی پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ کوہاٹ روڈ کی اراضی کو غیر موزوں قرار دے دیا گیا ہے۔ اور نئی جگہ کی تلاش شروع کر دی گئی ہے۔ یعنی ۱۹۶۶ء میں مسئلہ جہاں تھا اب بھی وہیں ہے۔ البتہ ہزاروں روپے اجلاسوں، نقشوں، مسودوں اور دیگر کاغذی کارروائیوں میں ضائع کئے جا چکے ہیں۔ مضافاتی بستی تعمیر کرنے کے لئے نئی جگہ کا انتخاب کرنے والے حکام کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مئی ۱۹۶۹ء کے دوسرے ہفتے میں اپنی رپورٹ پیش کریں۔ حکومت نے اس بستی کی تعمیر کے لئے پچاس لاکھ روپے بھی منظور کر دیئے تھے۔

سیٹلائیٹ ٹاؤن کی تعمیر میں مُسلسل تاخیر اور التوا نے پشاور کے شہریوں کے دلوں میں کئی قسم کے شبہات پیدا کر دیئے ہیں۔ مجوزہ سیٹلائیٹ ٹاؤن کے متعلق یہ بات عام ہو چکی ہے کہ "ٹاؤن" کی آراضی کو پلاٹوں کی شکل میں تقسیم کر کے فروخت کر دیا جائے گا۔ ہم یہ بات حکومت پر واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ ٹاؤن امراء کے لئے نہیں بلکہ معاشی طور پر کمزور لوگوں کے لئے تعمیر کیا جائے گا۔ جو لوگ ۳۰/- روپے اور ۵۰/- روپے

سرکاری پلاٹ

کی تقسیم میں

نیلام اور قرعہ اندازی

دونوں طریقے

ختم کئے جائیں

ماہوار کے درمیان کرایہ مکان ادا نہیں کر پاتے اور جن کو مُشکل سے دو وقت کی روٹی میسّر ہوتی ہے۔ وہ ان پلاٹوں کو کیسے خرید سکیں گے۔ اور اگر کسی طریقے سے وہ پلاٹوں کی قیمت ادا بھی کریں۔ تو مکان کی تعمیر کے لئے روپیہ کہاں سے لائیں گے۔ اگرچہ ایک ایسا ادارہ ہے جو مکان بنانے کے لئے سُود پر روپیہ قرض دیتا ہے۔ ہمارا اشارہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی طرف ہے مگر ایک تو یہاں سے قرض روپیہ حاصل کرنے کا طریقہ اتنا مشکل ہے کہ عام آدمی روپیہ حاصل نہیں کر سکتا۔ دوسرا سُود کی شرح بہت زیادہ اور ناقابلِ برداشت ہے۔ لہذا ایک غریب آدمی کے لئے خود مکان بنانا ناممکن بات ہے۔ اس لئے حکومت کو چاہیئے کہ ٹاؤن میں خود مکانات تعمیر کروائے اور بے گھر شہریوں کو الاٹ کر کے ان کے مکانوں کی قیمت آسان قسطوں کی صورت میں وصول کرے۔

مکانات کی تقسیم

اس سلسلے میں اس امر کے متعلق اظہار بھی ضروری ہے کہ مجوزہ مضافاتی بستی کے پلاٹ یا ان پر حکومت کی طرف سے تعمیر شدہ مکانات کن اُصولوں کی بُنیاد پر اور کس طریق کار کے تحت بے گھر لوگوں میں تقسیم کئے جائیں گے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بذریعہ نیلام فروخت کئے جائیں۔ جبکہ دوسرے حلقوں کی منشا ہے کہ فروخت بذریعہ قرعہ اندازی ہو۔ یہ پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ پشاور کے حالات کے پیشِ نظر مندرجہ بالا ہر دو طریقے بالکل ناموزوں اور ناجائز ہوں گے۔ کیونکہ اگر پلاٹ یا مکان بذریعہ نیلام فروخت کئے گئے تو خریدار وہ لوگ ہوں گے جو زیادہ سے زیادہ رقم دے سکیں گے۔ اور اس طرح امراء اور سرمایہ دار لوگ اس کام کو تجارت کے طور پر اپنا لیں گے۔ اور عام لوگوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ قرعہ اندازی کا طریقہ بھی نامناسب ہے۔ کیونکہ اس طریق کار کے تحت بھی ضرورت مند نظر انداز کر دیئے جائیں گے۔ اس لئے پلاٹ یا مکان پشاور کے ضرورت مند لوگوں کو مندرجہ ذیل شرائط پر دیئے جائیں:-

(۱) مکان کا ضرورت مند عرصہ دس سے پشاور میں رہ رہا ہو۔

(۲) وہ اپنا کوئی ذاتی مکان نہ رکھتا ہو۔ اور نہ ہی اس کی بیوی یا بچّوں کے نام پر کوئی مکان ہو۔

(۳) اس کی آمدنی ۵۰۰/- روپے سے کم ہو۔

(۴) جس شخص کو پلاٹ یا مکان الاٹ کیا جائے، اس سے تحریری بانڈ لیا جائے کہ وہ یہ پلاٹ یا مکان کم از کم دس سال تک نہ ہی فروخت کر سکے گا۔ اور نہ ہی کسی اور کے نام پر منتقل کرے گا۔

یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ اگر حکومت نے مندرجہ بالا شرائط کے تحت پلاٹ یا مکان الاٹ کئے تو اس طرح جائز حقداروں کو

بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو اضافی بستیاں تعمیر کرنے پر مجبور کیا جائے

ہی بل سکیں گے۔

ہم حکومت سے یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ:۔

(۱) مجوزہ سیٹلائیٹ ٹاؤن میں صرف ایک منزلہ مکانات تعمیر کئے جائیں نہ کہ بنگلے۔ کیونکہ اس طرح وقت، روپیہ اور جگہ کی بچت ہوگی۔

(۲) اس ٹاؤن کے لئے اراضی کا انتخاب بڑے سوچ سمجھ سے کیا جائے۔ نشیبی علاقوں میں یہ ٹاؤن قطعاً تعمیر نہ کیا جائے ورنہ زمین کے اثرات کی وجہ سے عمارات جلد از جلد خراب ہو جائیں گی اور نقصان ان لوگوں کو ہوگا جو نقصان برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔

(۳) مکانات پشاور کے جغرافیائی ماحول، ایک کنبے کی رہائش کے لئے معقول گنجائش اور حفظان صحت کے اُصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر تعمیر کئے جائیں۔

آخر میں ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر حکومت پوری دلچسپی سے لے تو "پشاور میں رہائشی مکانوں کا مسئلہ" نہایت خوش اسلوبی سے حل ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح کئی خاندانوں کو رہائشی تکالیف اور ذہنی اُلجھنوں سے چھٹکارہ مل سکتا ہے۔ اور ان کی زندگی سنور سکتی ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ صرف مجوزہ سیٹلائیٹ ٹاؤن کے منصوبہ پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ یہاں کے رہائشی مسائل کو حل کرنے کے لئے دیگر ذرائع کو بھی کام میں لائے، حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس علاقے میں کام کرنے والے بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور پشاور میونسپلٹی کو مجبور کرے کہ وہ پشاور میں مختلف مقامات پر چھوٹی چھوٹی کالونیاں تعمیر کریں۔ اس سے ایک تو ان اداروں کو منافع حاصل ہوگا، اور دوسرا اس علاقے کے لوگوں کی تکالیف بھی کم ہو جائیں گی۔ ان بنکوں اور دیگر اداروں نے اس علاقے سے کافی فوائد حاصل کئے ہیں۔ اس لئے ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اس علاقہ کی بہبود اور ترقی اور لوگوں کی بھلائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

پشاور میونسپلٹی نے اپنے ذرائع آمدن بڑھانے کے لئے پشاور میں کئی کمرشل عمارات تعمیر کی ہیں۔ اور کئی زیر تعمیر ہیں لیکن ابھی تک پشاور کے شہریوں کے لئے رہائشی سہولتیں مہیا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

مکتوبِ پشاور۔ فارغ بخاری

اسلام پسندوں کی انتخابی عذرداریاں، "مخالفوں نے اسلام کے نام پر ووٹ کیوں مانگے؟"

صوبہ سرحد کی اسلام پسند جماعتوں کے ناکام امیدوار جن میں قیوم لیگ اور جماعت اسلامی کے امیدوار بھی شامل ہیں جمعیت العلماء ہزاروی گروپ کے کامیاب امیدواروں کے خلاف اس بنیاد پر عذرداری کر رہے ہیں کہ جمعیت کے امیدواروں نے "اسلام اور قرآن کے نام پر" ووٹ حاصل کئے ہیں۔

غضب خدا کا جو لوگ اپنے حریفوں پر کفر کے فتوے لگاتے رہے اور خود اسلام کے واحد اجارہ دار ہونے کے دعوے کرتے رہے آج وہی لوگ اس امر پر معترض ہیں کہ اسلام کا نام کیوں استعمال کیا گیا۔ حالانکہ قیوم پارٹی سے لے کر جماعت اسلامی کے عہدیداران تک نہ صرف قرآن پاک لے کر در در ووٹ کی بھیک مانگتے رہے بلکہ ووٹروں کو خریدنے کے لئے اس کتاب مقدس پر نوٹ رکھ کر انہیں دیتے اور اب الٹا دوسروں کو الزام دے رہے ہیں۔

کیا یہی پاسپورٹ کا دفتر ہے؟

پاسپورٹ کی درخواستوں پر مہینوں کارروائی نہیں ہوتی، عرضی گذاروں کو بھکاریوں کی طرح دھتکار دیا جاتا ہے، عوام پر دفتر کے دروازے بند ہیں اور صرف اُن افراد پر کھلتے ہیں جو عملے کی خوشنودی حاصل کرنے کے قابل ہوں۔

حکومت نے اگر پاسپورٹ کے حصول میں یہی آسانیاں مُہیّا کی ہیں تو خدا کے لئے انہیں واپس لے لے۔

مارشل لاء گورنمنٹ نے کچھ عرصہ قبل اعلان کیا تھا کہ نئی ہدایات کے مطابق پاسپورٹ کے اجراء میں آسانیاں پیدا کر دی گئی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اعلان کا پاسپورٹ آفس کے بگڑے ہوئے عملے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بااثر لوگ تو مختلف ذرائع سے گھر بیٹھے کام کرا لیتے ہیں لیکن جو ان ذرائع سے محروم ہیں ان کی درخواستیں چھ چھ ماہ سے دفتر میں پڑی ہیں اور کوئی شنوائی نہیں ہوتی وہ تیس روپے پاسپورٹ فیس کی بھاری رقم کے ٹکٹ لگا کر فارم داخل کرتے ہیں لیکن دفتر میں انہیں بھکاریوں کی طرح دھتکارا جاتا ہے۔ عوام پر دفتر کے دروازے بند ہیں اور صرف ان افراد پر کھلتے ہیں۔ جو عملے کی خوشنودی حاصل کرنے کے قابل ہوں۔ دفتر کے باہر لوگوں کا ہجوم روزانہ صبح سے اس امید پر کھڑا رہتا ہے کہ ان کی بات سنی جائیں گی۔ انہیں صحیح جواب ملے گا۔ لیکن ۱۲ بجے اطلاع ملتی ہے کہ دفتر بند ہو گیا کل آیئے حالانکہ دفتر کا وقت ۲ بجے تک ہے لیکن اس دفتر کا عملہ ۱۲ بجے کے بعد کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ خدا جانے کیوں؟ — پاسپورٹ افسر سے چپراسی تک کوئی بھی ملازم شریفانہ طور پر بات کرنا جانتا ہی نہیں بلکہ کوں کی بد دماغی کا یہ عالم ہے کہ آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے کچھ کہیئے تو ان کا جواب یہ ہوگا "جایئے مارشل لاء والوں سے شکایت کر دیجئے"۔

حکومت نے پاسپورٹ کے حصول کے لئے جن سہولتوں کی یاد دہانی کرائی تھی اگر وہ یہی سہولتیں ہیں تو خدا کے لئے انہیں فوراً واپس لے لیا جائے۔

طلباء کے سامنے حمایت، سنڈیکیٹ میں مخالفت

یہ ہیں، میڈیکل کالج کے پرنسپل صاحب

پشاور یونیورسٹی کا میڈیکل کالج غیر معینہ عرصہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔

اس واقعہ کے پس منظر یہ ہے کہ طلبا نے مطالبہ کیا کہ انہیں پانچ فیصد گریس مارک دیئے جائیں اور دوسرے میڈیکل کالجوں میں طلبا کو جو سہولتیں حاصل ہیں وہ خیبر میڈیکل کالج کو بھی فراہم کی جائیں یونیورسٹی کے حکام کا کہنا ہے کہ گریس مارک دینے کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتے یہ بات ان کے احاطۂ اختیار میں نہیں ہے۔

یہاں تک تو یونیورسٹی کی انتظامیہ حق بجانب تھی۔ لیکن پرنسپل صاحب کے رویے نے معاملے کو سلجھانے کے بجائے زیادہ بگاڑ دیا کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پہلے تو یونین کے عہدے داروں اور نمائندوں کے سامنے پانچ فی صد رعائتی نمبر دینے کی تحریری سفارش کر دی لیکن سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں طلبا کے اس مطالبے کی شدت سے مخالفت کی۔ دوسرے روز طلبا کو اس بات کا علم ہوا تو یونین کے عہدے دار پرنسپل صاحب سے شکایت کرنے گئے طلبا کا بیان ہے کہ اس موقع پر پرنسپل صاحب کوئی معقول جواب دینے کے بجائے آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے نہ صرف دھمکیاں دیں بلکہ نہایت توہین آمیز الفاظ بھی استعمال کئے اور ایسی ناشائستگی کا مظاہرہ کیا جس کی توقع ایک ذمہ دار انسان سے ہرگز نہیں ہو سکتی، نتیجہ یہ کہ حالات قابو سے باہر ہو گئے اب طلبا کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ پرنسپل کو فوراً نکالا جائے اس پر ایسا ہنگامہ کھڑا ہوا جس پر قابو پانا انتظامیہ کے بس کی بات نہ رہی یہاں تک کہ میڈیکل کالج بند کرنا پڑا۔ یہاں کی تمام سیاسی پارٹیوں اور طلبا کی ساری یونینوں نے پرنسپل کو برطرف کرنے کے مطالبے کی حمایت کر دی ہے

کالج کو زیادہ دنوں تک بند نہیں رکھا جاسکتا اور موجودہ صورت حال میں اسے دوبارہ کھولنے کا راستہ یہی نظر آتا ہے کہ پرنسپل کو ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ انہوں نے معقولیت کا مظاہرہ نہیں کیا اور مسائل کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کے بجائے مزید الجھانے کا کردار ادا کیا ہے اگر طلبا کا یہ مطالبہ جلد از جلد پورا نہ کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ میڈیکل کالج کا دوبارہ کھولنا ممکن نہ ہوگا۔ بلکہ دوسرے کالجوں میں بھی ہڑتال کا خطرہ ہے جس سے ساری یونیورسٹی کا متاثر ہونا لازمی ہے

لیکچرار ہڑتال پر آمادہ ہیں

سرحد لیکچررز ایسوسی ایشن کے صدر نے اپنے ارکان کی طرف سے ہڑتال کی دھمکی دے دی ہے اور کہا ہے کہ اس کے بعد نتائج کی تمام تر ذمہ داری ان حکام کے سر ہوگی۔ جو ٹال مٹول سے کام لے کر ان کے جائز مطالبات کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں ایسوسی ایشن کا یہ دیرینہ مطالبہ ہے کہ انہیں "کلاس ون" کا درجہ دیا جائے اور عارضی لیکچررز کو مستقل کیا جائے۔ یونٹ ٹوٹنے سے پہلے پورے مغربی پاکستان کے اساتذہ کی تنظیم کے یہ مطالبات تھے۔ جسے اس وقت کے گورنر نے پورا کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ یونٹ ٹوٹنے کے بعد صوبائی سطح پر سارے مغربی پاکستان میں ان مطالبات کے لئے جدوجہد جاری رہی آخر حکومت کی سرد مہری سے تنگ آکر پنجاب کالجوں کے اساتذہ نے ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا لیکن پنجاب گورنمنٹ نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے انہیں درجہ اول دینے کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور دوسرے مطالبات کا جائزہ لینے کے لئے اعلیٰ اختیارات کی کمیٹی مقرر کر دی۔ لیکن سرحد گورنمنٹ نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے یہاں کے اساتذہ کی بے اطمینانی لازمی ہے صوبائی حکومت کا فرض ہے کہ وہ پنجاب گورنمنٹ کے فیصلے کی روشنی میں سرحد کے اساتذہ کی ایسوسی ایشن کے مطالبات پورے کر کے انہیں مزید پریشانی سے نجات دلائے۔

مزدوروں پر فائرنگ

گذشتہ روز پی اے ایف ٹیکسٹائل ملز جہانگیر کے مزدوروں اور پولیس میں تصادم ہو گیا۔ جس میں بیسیوں مزدور زخمی ہوئے بعد میں پولیس نے دس مزدوروں کو مارشل لاء کے تحت گرفتار کر لیا جن میں یونین کا صدر چمن خان بھی شامل ہے جہانگیر ملز میں مزدوروں اور مالکان کا تنازعہ ایک عرصہ سے چل رہا ہے سرمایہ داروں نے انتخابات میں ناکامی کے بعد ملک کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی مزدوروں سے انتقام لینے کے لئے ان کی چھانٹی اور حق تلفیوں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کی وجہ سے سرحد کی تمام ملوں میں مزدوروں میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے جہانگیر ملز میں مالکان کی دھاندلیوں کے خلاف یونین نے ہڑتال کا فیصلہ کیا حکومت سے استدعا کی گئی کہ وہ مداخلت کر کے مزدوروں کے جائز حقوق کا تحفظ کرے اور حالات کو خراب ہونے سے بچائے لیکن شنوائی نہ ہوئی اور ہڑتال کے لئے مزدوروں کو مجبوراً ہونا پڑا مالکان نے پرانے حربوں سے کام لیتے ہوئے معاملہ کو سلجھانے کے بجائے پاکٹ یونین کے ذریعے ہڑتال کو ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا مزدوروں نے مل کا گھیراؤ کر لیا مالکان تصفیہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور حکام کی طرف سے مزدوروں پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی اور جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پولیس کی حمایت حاصل کر کے مزدوروں پر فائرنگ کرنے کا بے بنیاد الزام لگا کر ان پر نہ صرف تشدد کیا گیا بلکہ الٹا مزدور لیڈروں کی گرفتاری بھی عمل میں لائی گئی۔ ہمارے ملک کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ سرمایہ داروں کو دھاندلی کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے جب کہ مزدوروں کو حکومت کی طرف سے حاصل ان کے جائز حقوق دلانے میں بھی حکومت کی مشینری بری طرح ناکام ثابت ہوئی ہے خصوصاً پولیس کے جانبدارانہ رویہ تو اب رسوا کن صورت اختیار کر چکا ہے جس کی اصلاح کی طرف اگر توجہ نہ کی گئی تو اس کے نتائج کسی وقت بھی تشویش ناک موڑ اختیار کر سکتے ہیں۔

اِقتصادی آزادی کیلئے ہمیں امریکہ کے حلقۂ اثر سے نکلنا پڑے گا

ہماری معیشت قسط ۲
انیس ہاشمی

ہمارے مُلک کی صنعت کا تقریباً ۳۰ فیصد سرمایہ غیر مُلکی ہے، جس سے ہمارا مُلک مغربی طاقتوں کا تابع ہوگیا ہے اور امریکہ ہم پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ ہم اپنے سکّے کی قیمت کم کردیں اور دھمکی دے رہا ہے کہ ایسا نہ کیا گیا تو مغربی طاقتیں ہم کو قرض کی فراہمی بند کردیں گی۔ ادارہ اس موضوع پر قارئین کی موافق اور مخالف آراء کا خیر مقدم کرے گا۔

الحمدللہ ہمارے ملک میں انتخابات مکمّل ہوئے۔ مُلک میں اُن سیاسی جماعتوں کو اکثریت حاصل ہوئی ہے (عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی ولی گروپ) جو پارلیمنٹری ڈیموکریسی کی حامی ہیں سیکولر سیاست پر یقین رکھتی ہیں اور اقتصادی میدان میں سوشلسٹ معاشرے کے قیام کی داعی ہیں۔ آجکل آئینی مسائل پر گفت و شنید ہو رہی ہے اُمید رکھنی چاہیئے کہ جلد یا بدیر ان مسائل پر افہام و تفہیم کے ذریعہ کوئی نہ کوئی درمیانی راستہ نکل آئے گا اگرچہ مسائل خاصے مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ ان آئینی مسائل کے ساتھ ساتھ مُلک اس وقت نہایت ہی نازک اور گھمبیر اقتصادی مسائل سے دوچار ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ مسائل یعنی اقتصادی مسائل آئینی اور سیاسی مسائل سے زیادہ اہم ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اقتصادیات سے شُدھ بُدھ رکھنے والا پڑھا لکھا طبقہ اس مسئلے کی نزاکت کو سمجھے اس پر غور و فکر کرے اور اس مسئلے کو سلجھانے کے لئے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرے۔

تیسری دُنیا کے مسائل

ہماری رائے میں ایشیا۔ افریقہ اور لاطینی امریکہ کے نو آزاد ممالک جن کو تیسری دُنیا (THIRD WORLD) یا ترقی پذیر ممالک (DEVELOPING COUNTRIES) کہا جاتا ہے (جن میں ہمارا وطن بھی شامل ہے) کو ایک ہی قسم کے اقتصادی مسائل درپیش ہیں۔ یہ مسائل کیا ہیں ہمارے نزدیک ان کو کچھ اس طرح ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

(۱) ان ممالک کی اقتصادی زندگی پر امریکی سرمائے کی گرفت۔

(۲) ان ممالک کی غیر ملکی غلامی کی وجہ سے اندرون ملک غربت۔ افلاس۔ پسماندگی اور جہالت اور ان وجوہات کی وجہ سے مختلف شعبوں سے تعلّق رکھنے والے (جیولوجسٹ۔ کیمسٹ۔ سائنس دان وغیرہ) ہنرمند افراد کی نایابی۔

(۳) ان ممالک میں صنعت کا نہ ہونا یا برائے نام ہونا اور بُنیادی صنعتوں کا فقدان۔

(۴) ان ممالک کی فی ایکڑ زرعی پیداوار کا کم ہونا اور اپنی آبادی کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مغربی ممالک سے اجناس درآمد کرنا۔

(۵) ملک میں کام کرنے کی صلاحیت رکھنے والے افراد (LABOUR FORCE) کو مُناسب کام فراہم کرنا۔

(۶) مندرجہ بالا کمزوریوں اور خامیوں کو کم سے کم وقت میں دُور کرنا۔

ان مشترکہ مسائل کے ساتھ ساتھ ہر ملک کے کچھ مخصوص مسائل بھی ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے مُلک کو جو مسائل درپیش ہیں اُن میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقّی کی رفتار میں فرق۔ مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان صنعتی اور زرعی پیداوار کے میدان میں فرق۔ مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں سرمایہ کاری کی کمی۔ ہندوستان سے تعلّقات میں کشیدگی کی وجہ سے پٹ سن۔ روئی اور دیگر اجناس کی فروختگی کے لیئے متبادل منڈیوں کی تلاش کوئلے وغیرہ کی درآمد کے لیئے ہندوستان کی بجائے متبادل انتظامات وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

اوپر بیان کیئے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لیئے چین شمالی کوریا۔ شمالی ویت نام اور کیوبا نے ایک طریقہ یعنی سوشلسٹ طریق پیداوار اختیار کیا ہے۔ پچھلی بیس پچیس برس کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ ملک اپنے تجربے میں بے حد کامیاب ہیں۔

ہمارے ملک پر ۲۰ ارب روپے کا قرض ہے، صنعتی ترقی کی رفتار خاصی سست ہے اور زرعی پیداوار میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے

دوسرے راستے پر مصر، یمن، لیبیا۔ سوڈان، تنزانیہ گنی وغیرہ گامزن ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ان ممالک نے غیر مُلکی (امریکی۔ برطانوی۔ فرانسیسی) سرمائے کو بلا معاوضہ ضبط کر لیا ہے۔ زرعی نظام میں دُور رس تبدیلیاں کی ہیں۔ بڑی بڑی زمینداریاں ختم کی ہیں، صنعت کے میدان میں مِلی جُلی اقتصادیات (MIXED ECONOMY) رائج کی ہے۔ اس نئی اقتصادی پالیسی کے نتائج آپ کے سامنے ہیں ان ملکوں میں صنعتی ترقّی کی رفتار بھی خاصی تیز ہے زرعی پیداوار میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور مُلک سے ناخواندگی بھی بتدریج کم ہو رہی ہے۔

تیسرے راستے پر ہمارا ملک چل رہا ہے یہاں نہ صرف یہ کہ غیر ملکی سرمایے پر کوئی پابندی نہیں ہے بلکہ ہم مغرب کے سرمایہ دار ممالک کو ہمہ وقت دعوت دیتے رہتے ہیں کہ آیئے ہمارے مُلک میں سرمایہ لگایئے۔ حکومت کے محکمے اس سلسلے میں خاص پمفلٹ شائع کرتے ہیں جن میں غیر ملکی سرمایہ داروں کو ہمارے مُلک میں سرمایہ لگانے کے فوائد گنوائے جاتے ہیں حکومت پاکستان کے اقتصادی مشیر جناب ایم ایم۔ احمد صاحب جو مغربی طاقتوں کے ہمنوا ہیں ہمیشہ مغربی سرمایہ داروں کی فراخدلی مغرب سے حاصل ہونیوالے سرمایے اور قرضوں کی خیر و برکت کے افسانے دن رات سُناتے رہتے ہیں۔ کنسورشیم کی میٹنگ میں شمولیت کے بعد جب مُلک واپس لوٹتے ہیں تو نہایت دلکش تصویر کھینچتے ہیں یہ علیحدہ بات ہے کہ ملک کو ہر سال نا اُمیدی کا مُنھ دیکھنا پڑتا ہے اور صورتِ حال جناب ایم ایم۔ احمد صاحب کی بیان کردہ تصویر سے خاصی مختلف ہوتی ہے۔ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ حصول آزادی کے بعد کے زمانے میں ہماری اقتصادی زندگی کو اُن حضرات نے ترتیب دیا (غلام محمد مرحوم۔ چودھری محمد علی۔ سیّد امجد علی۔ محمد شعیب۔ این ایم عقیلی۔ نواب مظفر حسین قزلباش) جو مغربی ممالک کے نظام پیداوار کے ہمنوا اور مدّاح تھے اور ملک میں دُور رس اقتصادی تبدیلیوں کے مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج تک برطانوی کامن ویلتھ کے ممبر ہیں۔ ہمارے مُلک پر بیس ارب روپیہ قرض ہے ملک میں صنعتی ترقی کی رفتار خاصی سُست ہے۔ زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو رہا ہے (ہر سال امریکہ آسٹریلیا۔ کینیڈا وغیرہ سے رقم قرض فراہم کرکے زرعی اجناس درآمد کرنا ہوتی ہیں) مُلک کو ایک ارب روپیہ سالانہ زرمبادلہ کی شکل میں سود اور اصل کی صورت میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ ملک کی صنعت میں تقریباً تیس فیصد غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا ہے ملک اس قدر مغربی طاقتوں کا طابع ہوگیا ہے کہ امریکہ کو یہ ہمّت ہوگئی ہے کہ وہ ہم پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ ہم اپنے سکّے کی قیمت کم کردیں اور دھمکی دے رہا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مغربی طاقتیں ہم کو قرض کی فراہمی بند کردیں گی۔ کہا جاتا ہے کہ ایم ایم۔ احمد صاحب اُس لابی (LOBBY) کے لیڈر ہیں جو امریکہ کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصّواب۔

لانگ ٹرم (LONG TURM) مسائل کس طرح حل کئے جائیں اور ان مسائل کو حل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یہ کام ہمارے ملک کے پڑھے لکھے طبقے کا ہے کہ وہ اس پر سنجیدگی سے غور کرے اور اُس راستے کو اختیار کرانے کے لئے ارباب حل وعقد پر دباؤ ڈالے آزادی کے حصول کے بعد کے زمانے کی تاریخ شاہد ہے کہ ہم جس اقتصادی راستے پر گامزن ہیں وہ فتح ونصرت کا نہیں بلکہ تباہی اور بربادی کا ہے۔

ڈالر پہ بُرا وقت

ہم آج کی صحبت میں اس مسئلے پر مختصراً گفتگو کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے سکے کی قیمت میں کمی ہونے کی وجہ سے پیدا ہوگی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دو عالمگیر جنگوں (1914 - 1918) (1938-1945) کے بعد کے زمانے میں امریکی سکے کو سرمایہ دار دُنیا میں بالادستی حاصل ہوگئی ہے اور جو ملک بھی اپنے سکے کی قیمت کم کرتا ہے وہ امریکی سکے یعنی ڈالر کے تبادلے کی مقدار پر مقرر کرتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب دُنیا میں برطانوی سکے پونڈ کو فوقیت حاصل تھی یہ فوقیت پہلی عالمگیر جنگ کے بعد سے زوال پذیر ہونا شروع ہوئی اور دوسری عالمگیر جنگ کے بعد پونڈ کی حیثیت ثانوی ہوگئی اس کے معنی یہ ہوئے کہ ساری سرمایہ دار دُنیا کی اقتصادیات دوسری عالمگیر جنگ کے بعد امریکی معیشت کے طابع ہوگئی۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ سوشلسٹ بلاک کے قیام۔ سوشلسٹ بلاک کی بڑھتی ہوئی پیداوار اور کل دُنیا کی پیداوار میں سوشلسٹ بلاک کی پیداوار کے تناسب میں روز افزوں اضافہ جنگ ویت نام، کمبوڈیا اور مشرق وسطےٰ کی جنگ میں امریکہ کی براہ راست مداخلت کی وجہ سے امریکی سکے ڈالر پر مرگی کے دورے پڑ رہے ہیں، اور وہ اسپیشل ڈرائنگ رائٹس (SDR) کی بیساکھی کے سہارے زندہ ہے۔

گرانی میں اضافے کا عمل

آزادی کے حصول کے بعد ہم نے دورِ غلامی کا سارا اقتصادی ڈھانچہ من وعن قائم رکھا برطانیہ سے اپنے اقتصادی مراسم بھی جوں کے توں قائم رکھے لہٰذا ہم اقتصادی سید۔ ان میں امریکہ کے بھی طابع ہو گئے اس اقتصادی محکومی کی وجہ سے ہماری سیاسی آزادی کو گھن لگ گیا اور ہم نے اپنی مقدس سرزمین پر غیر ملکی اڈے قائم کرائے۔ جو آزاد ملک اپنے سکے کی قیمت کم کرتا ہے اس کی وجہ سے اکثر اس کی برآمدات عارضی طور پر بڑھ جاتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری صنعت جو مال برآمد کرنے کے لئے تیار کرتی ہے وہ ہم برآمد کر لیتے ہیں اگر خام مال کی فروختگی میں کچھ قباحت ہوتی ہے وہ ایکسپورٹ بونس سکیم سے حل ہو جاتی ہے اس کے علاوہ ہمارے جنس کے بدلے جنس کے تبادلے کے معاہدے (BAR-TER AGREEMENTS) میں ان بارٹر معاہدوں کا دائرہ (SCOPE) اور وسیع کیا جا سکتا ہے ہم ہندوستان سے بھی بارٹر معاہدے کر سکتے ہیں۔ ہندوستان سے یہ تجارت بہ آسانی ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان اور ٹریڈنگ کارپوریشن آف انڈیا کے ذریعوں سے ہو سکتی ہے۔ ہندوستان سے جو بارٹر معاہدہ کیا جائے اس میں مشرقی پاکستان کی گیس کی برآمد۔ مچھلی کی برآمد۔ کوئلے کی درآمد۔ پٹ سن کی برآمد وغیرہ شامل کی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا مناسب ہوگا۔ کہ مچھلی کی برآمد ۶۵ء میں سے بیشتر کے زمانے میں پرائیویٹ سیکٹر کیا کرتا تھا اور مچھلی کی قیمت سیالدہ کا کسٹم مقرر کرتا تھا سارے لیٹر اور کریڈٹ بینک آف بڑودہ کی معرفت کھولے جاتے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ صورت حال مناسب نہیں تھی یہ کام ٹی سی پی (T C P) کی معرفت انجام دیا جائے تو بہتر نتائج مرتب ہوں گے ایسی صورت میں جب کہ ہماری صنعتی اور زرعی پیداوار برآمد ہو جاتی ہے تو امریکی دباؤ قبول کر کے سکے کی قیمت میں کمی کرنا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہمارا خیال ہے سکے کی قیمت میں کمی کرنے کی صورت میں ہماری صنعتی پیداوار کے اخراجات (COST-OF PRODUCTION-) بڑھ جائیں گے ہماری صنعتی پیداوار کی رساوری قیمتوں میں اضافہ ہو جائے گا جس کی وجہ سے ہماری برآمدات پر بُرا اثر پڑے گا۔ ہمارے خیال میں سکے کی قیمت کم کرنے کی صورت میں اندرون ملک بھی گرانی میں مزید اضافہ ہوگا جو ملک میں بے چینی پیدا کرنے کا سبب ہوگا۔

سرمائے کے حصول کا مسئلہ

ہم اگر سکے کی قیمت کم نہیں کرتے (جو ہم کو نہیں کرنی چاہیئے) تو اس صورت میں ہم کو اپنے چوتھے پنج سالہ منصوبے کے لئے جو غیر ملکی زرمبادلہ درکار ہے اس کے لئے چند غیر معمولی طریقے اختیار کرنے ہوں گے۔ ہمارے سامنے دوسرے ایشیائی ملکوں کی مثالیں موجود ہیں ہماری رائے میں وقت آگیا ہے کہ ہماری حکومت ہمت کرے اور وہ اقدامات کرے جو مصر تنزانیہ وغیرہ نے کئے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ان اقدامات سے ان مسائل کو حل کیا جا سکے گا اور پاکستانی عوام بھی بیک آواز حکومت کے ان اقدامات کی حمایت کریں گے۔

سکّے کی قیمت کم کرنے سے معاشی بحران بڑھ جائے گا

بیرونی قرضے پر سود کی رقم ۱۵۰ کروڑ روپے سالانہ ہو جائے گی

(سی۔ آر۔ اسلم)

گذشتہ چند روز سے اخبارات میں ایسی خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی سکے کی قیمت کم کرنے پر غور ہو رہا ہے۔ چند ماہ قبل بھی ایسی خبریں اڑی تھیں تو صدر مملکت نے کہا تھا کہ پاکستانی سکے کی قیمت کم نہیں کی جائے گی۔ لیکن ان کی اس یقین دہانی کے باوجود اجارہ دار سرمایہ دار اور ان کے دانشور سکے کی قیمت گھٹانے کی ضرورت پر مسلسل زور دیتے رہے ہیں اور اب اپنا زور قلم اور زور بیان عوام کو یہ باور کرانے میں لگا رہے ہیں کہ پاکستان کی معاشی مشکلات کا حل سکہ کی قیمت گھٹانے پر ہی منحصر ہے چند سیاسی رہنما بھی ان کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق پاکستان کی دونوں اکثریتی پارٹیاں پاکستان پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے رہنما بھی اس سے متفق ہیں۔

سکّے کی قیمت گرانے کے اس اصرار کے پیچھے امریکی سامراج اور عالمی بینک کا بھی ہاتھ ہے۔ جو کئی سال سے پاکستان کی حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ کہ وہ پاکستانی سکے کی قیمت کم کر دے سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کش عوام کی استحصالی کا اور سرمایہ داروں کی منافع خوری کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سکے کی قیمت گرائی جائے۔ سکے کی قیمت کا کم کرنے کا ایک ذریعہ افراط زر ہے۔ جس سے سکے کی قیمت بغیر کسی اعلان کے گھٹ جاتی ہے۔ اور اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو ہمارے ملک میں مدت سے جاری ہے اور پچھلے چند ماہ میں عوام کو یہ تلخ تجربہ ہوا ہے کہ ادھر سٹیٹ بینک نے نوٹ جاری کئے اور اُدھر اشیائے ضرورت کی قیمتیں سیلاب کی طرح بڑھنے لگیں۔ اس گرانی نے محنت کش عوام کم تنخواہ کے ملازموں، نچلے درمیانہ طبقے اور چھوٹے کاروباری لوگوں کو پیس کر رکھ دیا ہے اور اجارہ دار سرمایہ داروں اور بڑے تاجروں کو انتہائی فائدہ پہنچایا ہے۔ جس طرح اندرون ملک سکے کی قیمت گرانے کا طریقہ افراط زر ہے یونہی دوسرے ملکوں کی کرنسی کے ساتھ جو شرح تبادلے کی ہوتی ہے اس میں تبدیلی حکومت کرتی ہے اور اسے سکے کی قیمت کم کرنا کہتے ہیں۔

آج پاکستان کی کرنسی کی قیمت کو کم کرنے پر زور دینے والے پاکستانی اجارہ دار اور سرمایہ دار اور بڑے تاجر ہیں۔ ان کے دانشوروں کے دلائل یہ ہیں کہ سکے کی قیمت کم کرنے سے پاکستان کے مال کی مانگ سرمایہ دار ملکوں میں بڑھ جائے گی۔ اور زیادہ برآمدات سے زرمبادلہ میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا۔ جس سے ہم اپنے موجودہ کارخانوں کے لئے فالتو پرزے اور خام مال کی ضرورت پوری کر سکیں گے۔ نیز گذشتہ پندرہ سال سے بیرونی تجارت میں تجارتی

عدم توازن کے باعث ہمیں جو خسارہ ہو رہا ہے، اسے ختم کر سکیں گے۔ سرمایہ دار ملکوں کے قرضے اور سود کی ادائیگیوں اور مزید قرضوں کے حصول میں بھی اس طرح آسانی ہو گی۔ اور ترقیاتی منصوبوں اور تجارت میں زبردست اضافہ ہو گا۔

پاکستانی سکّے کی قیمت گرا کر امریکی سامراج اپنے سیاسی مقاصد پورے کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ خوب جانتا ہے کہ جب تک بھارتی سکّے کی قیمت پاکستانی سکّے سے کم ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی رشتے اور دوستی قائم نہیں کی جا سکتی۔ اور دوستانہ تعلقات قائم کئے بغیر پاکستان اور بھارت اس کی عالمی سیاست کے صحیح طور پر مہرے نہیں بن سکتے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کیلئے وہ پاکستانی سکّے کی قیمت گرانے کے لئے مسلسل دباؤ ڈالتا رہا ہے تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان جو خلیج ہے اسے پاٹ سکے۔ اس کے ساتھ وہ اپنے اجارہ دار سرمایہ داروں کو منافع خوری کے زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کرنا چاہتا ہے۔

برآمدی تجارت کو فائدہ نہ ہو گا

سرمایہ داری نظام کا یہ خاصہ ہے کہ اسے جب بھی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ سکّے کی قیمت گرا کر اُسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی زد براہِ راست محنت کش عوام درمیانہ طبقہ اور چھوٹے کاروباری لوگوں پر پڑتی ہے اس حربے سے سرمایہ دار طبقہ اپنا منافع برقرار رکھتا ہے۔ اور اس میں اضافہ کرتا ہے اس لئے پاکستانی قیمت گرانے کی جس طرف سے بھی تائید کی جاتی ہے خواہ وہ سیاسی رہنماؤں کی طرف سے ہو یا منافع خوروں، اجارہ دار سرمایہ داروں اور بڑے تاجروں کی طرف سے ہو، اس کا ایک ہی مقصد ہے کہ ملکی منافع خوروں کی لوٹ کو بڑھایا جائے۔ اور غیر ملکی سرمایہ داروں کو مزید منافع کمانے کا موقع فراہم کیا جائے۔ انہی وجوہ کی بنا پر ہمارے نزدیک سکّے کی قیمت گرانا عوام اور پاکستان سے کھلی دشمنی کے مترادف ہے۔

پاکستان کی برآمدات میں زرعی اجناس۔ پٹ سن۔ روئی۔ چاول اون اور کھالیں وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ خام مال ہے جس کی دنیا کی ہر منڈی میں مانگ ہے اور جس کو برآمد کرنے میں پاکستان کو کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی ہے۔ سکّے کی قیمت گرانے سے اس کی برآمدی تجارت کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ بلکہ الٹا یہ اثر پڑے گا کہ ان اجناس کی برآمد سے جو زرمبادلہ ہم کماتے ہیں۔ اس کی مقدار گھٹ جائے گی۔ یعنی ہماری ان اجناس کی موجودہ قیمت کم ہو جائے گی اور درآمدی چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہو جائے گا۔ جس کا اثر اشیائے ضرورت کی چیزوں پر پڑے گا اور یہ دُوگنی تگنی ہو جائیں گی اس کی زد محنت کش عوام ملازمین اور چھوٹے کاروباری لوگوں اور درمیانی طبقے پر پڑے گی۔ پاکستان کے سکّے کی قیمت گرانے سے غیر ملکی قرضہ جو ہم نے حاصل کر رکھا ہے۔ اس کی مقدار از خود بڑھ جائے گی اور اس کے سود میں اضافہ ہو جائے گا۔

مثلاً ۳۱-۱۲-۷۰ تک پاکستان نے جو قرضہ حاصل کیا ہوا ہے۔ وہ چار ارب چونتیس کروڑ دس لاکھ ڈالر ہے۔ یہ رقم موجودہ شرح تبادلہ کے حساب سے بیس ارب اٹھارہ کروڑ ستر لاکھ روپے کے مساوی ہے۔ پاکستانی سکّے کی قیمت گرانے کے بعد یہ قرضہ اکتیس ارب اسی کروڑ اسی لاکھ روپیہ ہو جائے گا اور یہ پاکستان کی سالانہ برآمدات سے تین گنا زیادہ ہو گا۔ اس طرح سود کی ادائیگی موجودہ شرح تبادلہ کے حساب سے سو کروڑ روپے سے بڑھ کر ایک سو پچاس کروڑ روپے سے زیادہ ہو جائے گی۔ اور پاکستان کی معیشت پر اتنا بوجھ بڑھ جائیگا جو عوام کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گا۔

پاکستان کے سکّے کی قیمت گرانے سے پاکستان کے بڑے تاجروں، اجارہ دار سرمایہ داروں اور سامراجیوں کو تو یقیناً فائدہ ہو گا۔ لیکن پاکستان کے محنت کش عوام قلیل آمدنی کے لوگ اور چھوٹے کاروباری نقصان اٹھائیں گے۔ پاکستان کے مزدور۔ کسان اور دانشور اپنی قوت محنت اور ذہنی صلاحیتوں سے ملکی پیداوار میں جتنا بھی اضافہ کریں گے۔ اس کا فائدہ ان کی خوش حالی کے بجائے معاشی بدحالی کی صورت میں نکلے گا۔

مضبوط معیشت کے لئے تجویزیں

تجربہ شاہد ہے کہ بھارت اور دوسرے ترقی پذیر ملکوں نے عالمی بینک اور امریکی سامراج کے دباؤ اور اصرار سے مجبور ہو کر جب بھی سکّے کی قیمت گھٹائی ہے۔ اشیاءِ ضرورت کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اور اقتصادی بدحالی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ پاکستان کے موجودہ معاشی بحران پر قابو پانے کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان اپنی معاشی۔ تجارتی اور اقتصادی پالیسیوں میں دور رس بنیادی تبدیلیاں کرے۔ سامراجی سرمائے اور قرضوں پر انحصار ترک کرے قرضوں اور سود کی ادائیگی سے انکار کرے بیرونی تجارت، اجارہ دار صنعتوں، بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لے۔ موجودہ فرسودہ زرعی جاگیرداری نظام، بلا معاوضہ ختم کرے۔ اور اپنی تجارتی وابستگی سرمایہ دار ملکوں سے ختم کر کے سوشلسٹ ملکوں اور نو آزاد ملکوں سے تجارت بڑھائے ساتھ ہی اقتصادی ترقی کی پالیسی میں بنیادی اور بھاری صنعتوں کے قیام کو اولیت دے کر انہیں نجی شعبے میں قائم کرے۔ تاکہ ایک آزاد اور خود کفیل معاشی نظام کی ٹھوس بنیادیں استوار ہو سکیں یہی واحد راستہ ہے۔ عوام کی خوشحالی اور معاشی ترقی کا۔

مکتوبِ حیدر آباد

احمد الطاف

یہ اردو اور سندھی کتابیں جلانے والے کون ہیں؟

پیپلز پارٹی کی لسانی کمیٹی میں لسانیات کے ماہر شامل نہیں

سندھ میں لسانی تنازعہ ابھی ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ مفاد پرست اور خود غرض عناصر اس مسئلہ کو ہوا دے کر اور بھڑکا رہے ہیں۔ گذشتہ ہفتہ جامعہ سندھ کے ادارہ سندھولوجی، میں رات کی تاریکی میں پُراسرار اور مجرمانہ آتش زنی کے بعد یہ آگ اور شدت سے پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندرون سندھ شعلوں کی لپیٹ میں ہے کہا جاتا ہے کہ ادارہ سندھولوجی میں انتہا پسند اور تخریبی عنصر نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آگ لگا کر سندھی علم و ادب اور تاریخ کے انمول خزینہ کو وحشیانہ انداز میں جلا کر خاکستر کر دیا جسے تعلیمی ثقافتی اور تہذیبی ورثہ سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ ہی زبان و ادب کو فروغ دینے سے کوئی دلچسپی ہے۔ نادر و نایاب کتابوں، بیش قیمت مخطوطات اور قدیمی و تاریخی نسخوں اور دستاویزوں کو جلا کر خاک کرنے والے حقیقی مجرم عناصر، فتنہ و فساد برپا کر کے آگ و خون کی ہولی کھیلنا چاہتے تھے تاکہ اُن کے مذموم مقاصد پورے ہوں نئے اور پرانے سندھیوں کے مابین خلیج وسیع ہو۔ امن و آشتی کا ماحول غارت ہو اور مظلوم و محروم عوام اپنے بنیادی و حقیقی مسائل پر توجہ دے کر معاشی جدوجہد سے غافل ہو جائیں۔

ادارہ سندھولوجی، میں بھڑکائی ہوئی آگ کے شعلے سندھ کے دور دراز گوشوں تک پہنچ کر ہوش و خرد پر برق گرا رہے ہیں۔

اِس سانحہ کے تیسرے دن جامعہ سندھ کے شعبۂ اُردو پر طلبا کے ایک گروہ نے دوبارہ قابض ہو کر سمینار لائبریری کی تقریباً تمام اردو کتب نذرِ آتش کر دیں۔ ایک غریب ہاکر سے اردو اخبارات کا بنڈل چھین کر راکھ کر دیا۔ اِس سانحہ سے متعلق سندھ یونیورسٹی نے اخبارات میں جو تردید شائع کرائی ہے۔ تحقیق کے بعد وہ گمراہ کن ثابت ہوئی، عینی شاہدوں کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ شعبہ کی سمینار لائبریری کی اردو کتابوں سے ہولی کھیلی گئی۔ واضح رہے کہ شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں ریٹائر ہو گئے ہوئے ہیں اور قائم مقام صدرِ شعبہ جناب قاضی محمد مرتضیٰ صاحب اس

۳۶۵ کسان خاندانوں کو بنگلہ دیش واپس جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے

یا کبھی سانحہ کے وقت شعبہ میں موجود نہیں تھے۔

اخبارات اور کتابوں کو نذرِ آتش کرنے کے علاوہ بعض مقامات سے طلباء کے مخالف گروہوں میں تصادم کی بھی المناک خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ سانحوں کے تدارک اور کشیدگی دور کرنے کے لئے امن پسند حلقے اور ترقی پسند قوتیں برابر کوشاں ہیں۔ اس سلسلہ میں سکھر، لاڑکانہ، دادو اور میرپور خاص میں نمائندہ شہریوں نے امن کمیٹی بنا کر صلح کی اپیلیں کی ہیں، خیرپور میں پیپلز پارٹی کے منتخب رکن قومی اسمبلی سید قائم علی شاہ اور نیپ کے مقامی رہنماؤں نے باہمی اخوت اور بھائی چارے کی مثبت مساعی کی ہیں۔

لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ بعض افراد ان کوششوں پر پانی پھیرنے کے لئے منفی حرکات کر رہے ہیں جس سے نہ تو کسی زبان کو فائدہ پہنچے گا اور نہ ہی اس زبان کے بولنے والوں کو۔ مثلاً ایک مقامی روزنامہ کی خبر کے مطابق "ادارہ سندھولوجی" کے ایک سابق ڈائرکٹر حنیف صدیقی نے ایک بیان میں کہا کہ "اگر اردو والے اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو دو نکاتی پروگرام کے تحت سندھی طلباء کو مکمل طور پر اردو پڑھنے سے منع کر دیا جائے گا۔ ان کی کتابیں جلا دی جائیں گی، اردو اخبارات و رسائل کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ اور اگر حکومت نے ہمارے مطالبہ کی تکمیل نہیں کی تو عید الاضحی کے بعد ہی زبردست تحریک کا آغاز کر دیا جائے گا جس کے لئے ایک دفاعی کمیٹی کی تشکیل کے ذریعہ دس ہزار رضاکاروں کا جیش بھرتی کیا جا رہا ہے۔ یہاں یہ بات معنی خیز ہے اور اسے تشویش کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے کیونکہ جارحانہ قوتوں کا یہ مزاج رہا ہے کہ وہ دفاع کے نام پر حملہ آور ہوتی ہیں۔

پیپلز پارٹی کی لسانی کمیٹی

دریں اثناء پیپلز پارٹی نے اپنے چیئرمین کے زیرِ صدارت ۴ر فروری کے اجلاس منعقدہ کراچی میں، لسانی مسئلہ کا جائزہ لینے اور سفارشات پیش کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کے تین ارکان کے ناموں کا اعلان کیا گیا ہے باقی ارکان کے تقرر کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ یہ کمیٹی آٹھ دس دن میں اپنی سفارشات پیش کرے گی۔ پیپلز پارٹی کے رکن قومی اسمبلی عبدالحفیظ پیرزادہ نے کہا ہے کہ "اُن کی پارٹی عنقریب اُن عناصر کی سازشوں کو بے نقاب کر کے سیاسی کارروائی کرے گی اُنہوں نے اپنی پارٹی کے اراکین اسمبلی سے کہا کہ وہ اپنے علاقوں اور حلقوں میں پھیل جائیں اور حالات کو معمول پر لانے کے لئے کام کریں۔

یہاں پیپلز پارٹی کی قائم کردہ لسانی کمیٹی کے تقرر کو سراہتے ہوئے دانشور حلقے اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی لسانی تنازعہ کو ختم کرانے اور اس مسئلہ کو حقیقت کی روشنی میں حل کرنے کے لئے مثبت فارمولا پیش کرے گی لیکن اُن کا کہنا ہے کہ تاحال کمیٹی کے جن ارکان کے ناموں کا اعلان کیا گیا ہے اُن میں کوئی ماہرِ تعلیم اور ماہرِ لسانیات و عمرانیات نہیں ہے جبکہ لسانی کمیٹی کو ماہرین کی خدمات حاصل ہونا ضروری ہے۔

گزشتہ روز حیدرآباد میں، غلام محمد بیراج سے سیراب ہونے والے علاقہ (ٹنڈو محمد خاں اور گولارچی کے آس پاس) آباد بنگالی کاشتکاروں نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا ہمیں محکمۂ مال کے حکام تباہ و برباد کرنے کے بعد زمینیں چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ تین ماہ قبل، شدید بارشوں میں ہماری کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ حکومت نے تقاوی قرض کے طور پر جو امداد دی تھی اُس میں سے ایک پائی بھی بنگالی کاشتکاروں کو نہیں دی گئی حالانکہ گورنر نے اس سلسلے میں واضح احکام جاری کئے تھے اور ڈویژنل کمشنر نے منظور شدہ امداد کی فراہمی کا یقین دلایا تھا۔ بنگالی کرشک سمتی کے ۳۶۵ خاندانوں کے نمائندوں نے بتایا کہ اُن کے خاندان فاقہ کشی میں مبتلا ہیں۔ ایک فصل بارش نے تباہ کی، دوسری فصل امداد نہ ملنے کے سبب نہیں ہو سکے اور اب تیسری فصل اُس وقت ہو سکتے ہیں جب فصل تیار ہونے تک گزر اوقات کا بندوبست ہو۔ اُنہوں نے بتایا کہ دس برس قبل ۱۹۶۱ء میں ہمیں بنجر، ویران اور پتھریلی زمینیں دی گئی تھیں جسے ہم نے شب و روز محنت کے بعد قابلِ کاشت بنایا اور کھیتی باڑی کی۔ اب ہمیں یہ زمینیں چھوڑ کر واپس بنگلہ دیش چلے جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ بنگالی کرشک نمائندوں نے بتایا کہ ذمہ دار افسران کے دفاتر میں ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم تمہیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتے، اگر اُنہیں ہماری آبادکاری منظور نہیں تو ہمیں واپس پوربو پاکستان بھیج دیا جائے یا افسران رویہ تبدیل کریں۔ اُنہوں نے شکایت کی کہ ہماری زمینوں کے درمیان وہ چھوٹے قطعات جو ہمیں ملنے چاہئیں، دوسروں کو الاٹ کئے جا رہے ہیں تاکہ جھگڑے ہوں اور ہم تنگ آکر بھاگ جائیں۔ اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ قرض کے لئے وہی حکومت ہماری ضمانت لے جو ہمیں ایک ہزار میل سے یہاں لائی ہے کیونکہ مفلس و قلاش ضمانت کہاں سے لائیں"۔

حکومتِ سندھ وضاحت کر کے غلط فہمی دور کرے

یہاں گزشتہ چند روز سے حکومتِ سندھ کے اُن احکام کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار کیا جاتا ہے، جن کی رو سے صوبائی ملازمتوں کی آسامیوں کو پُر کرنے کے لئے غیر منصفانہ کوٹہ مقرر کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کراچی، حیدرآباد، سکھر اور دیگر شہروں کا حصہ سرکاری ہدایت کے مطابق چالیس فیصد اور دیہی کوٹہ ساٹھ فیصد مقرر کیا گیا ہے۔ اس فیصلے سے مستحق لوگوں کی حق تلفی بڑھے گی۔

حال ہی میں حکومتِ سندھ کے ایک ترجمان نے اس خبر کی تردید کی ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ ایسا کوئی حکم یا فیصلہ صادر نہیں کیا گیا، لیکن مصدقہ ذرائع کے مطابق حکومتِ سندھ کے چیف سیکریٹری کی جانب سے انتظامیہ کے تمام سیکریٹریوں اور ذیلی محکموں کے سربراہوں کے نام ۱۶ر جنوری ۱۹۷۱ء کو (Recruitment Policy in Public Services) کے سبجکٹ کی رو سے ایک مراسلہ بحوالہ نمبر NO.SOI — (SGA & ID) 23/1/71 حکومتِ سندھ (سروسز، جنرل ایڈمنسٹریشن اور محکمۂ اطلاعات) ارسال کیا گیا تھا۔ حکومتِ سندھ کے اس اقدام کی تصدیق اس مراسلے سے ہوتی ہے۔ کیا حکومتِ سندھ اس سلسلے میں ضروری وضاحت کر کے عوام میں پائی جانے والی بے چینی اور غلط فہمی کا ازالہ کرے گی؟

سندھ میں پیپلز پارٹی کی متوقع وزارت سازی اور وزیرِ اعلیٰ کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائی کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں عوامی و سیاسی حلقوں میں یہ تاثر عام ہے کہ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ، پیپلز پارٹی سندھ زون کے چیئرمین میر رسول بخش خان تالپور ہوں گے۔ بعض حلقہ لاڑکانہ سے صوبائی اسمبلی کے ممبر غلام رسول کیہر اور کچھ لوگ ٹنڈو آدم شہدادپور کے حلقہ سے منتخب ہونے والے ممبر سندھ اسمبلی اور مخدوم گروپ کے جام صادق علی کا نام لے رہے ہیں۔

دریں اثناء معلوم ہوا کہ نواب شاہ کے ایک قومی حلقے سے منتخب رکن مرکزی اسمبلی غلام مصطفےٰ جتوئی بھی وزارتِ اعلیٰ کے امیدوار ہیں جس کی خاطر عنقریب وہ مرکزی اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو کر صوبائی حلقے سے ضمنی انتخاب میں کھڑے ہونے کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں۔

اظہارِ تعزیت

سلیمان برادرز، نیوز ایجنسی، حیدرآباد کے بھائی عبدالستار کریمی کی وفات پر ادارہ "لیل و نہار" پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

امان اللہ خاں کون ہے؟

مزدوری اس کی پونجی اور فٹ پاتھ اس کا گھر تھا۔

گلگت کا محبوب رہنما کراچی میں

اے۔ آر۔ خان ۔۔ کراچی



محاذِ آزادی کے رہنما امان اللہ خان

گلگت کے نظربندوں میں ایک نام امان اللہ خاں کا آتا ہے۔ امان اللہ خاں جموں وکشمیر قومی محاذ آزادی کی بانی کمان میں شامل ہیں اور اس تحریک کے ممتاز رہنما ہیں، جس کا مقصد گلگت اور بلتستان کے عوام کو شخصی حکومت اور آمرانہ ظلم و استبداد سے نجات دلانا ہے۔

امان اللہ خاں ایک نوعمر سیاسی رہنما ہیں۔ کراچی کے شہریوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ خدا کی لاکھوں مخلوق جو دن میں محنت مشقت کرنے کے بعد راتوں کو اس شہر کے فٹ پاتھ پر سو رہتی ہے، انہی میں گلگت کا ایک لڑکا امان اللہ بھی مدتوں شامل رہا ہے۔ امان اللہ کو اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا، کیونکہ اس شہر نا پرساں میں وہ ایک نادار مزدور، ایک بے روزگار کلرک، ایک بے وسیلہ طالب علم اور ایک درماندہ استاد کی زندگی گذار رہا تھا۔ آج یہی سخت کوش، جہد آزما اور مخلص نوجوان، گلگت اور بلتستان کے عوام کا رہنما اور تحریک آزادی کشمیر کا پرجوش کارکن ہے۔

شاندار تعلیمی کردار
اندوہناک بیروزگاری

امان اللہ خاں کی زندگی، ایک طالب علم کی حیثیت سے قابل رشک رہی ہے۔۔ ۱۹۵۰ء میں جموں وکشمیر یونیورسٹی سے میٹرک کے امتحان میں اول آنے والے طالب علم کا بہت چرچا ہوا۔ یہ طالب علم وہی امان اللہ خان تھے، جنہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کا بیشتر زمانہ، مقبوضہ کشمیر میں گذارا۔ امان اللہ خاں گلگت ایجنسی کے موضع پرشنگ (استور) میں ۲۴ اگست ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے تھے وہ اپنے والدین کی اکیلی نرینہ اولاد ہیں۔ امان اللہ ابھی دو ہی سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چند ناگزیر اسباب کے تحت، انہیں وادی کشمیر میں اپنی بہن کے یہاں منتقل ہونا پڑا۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے وہیں حاصل کی۔ پرائمری اور مڈل کے امتحان میں امتیازی طور پر کامیاب ہوتے رہے پھر ۱۹۵۰ء میں ہنڈواڑہ سے میٹرک کا امتحان، شاندار طریقے سے پاس کیا۔ تعلیم جاری رکھتے ہوئے انہوں نے سری نگر کے ایس پی کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن جنوری ۱۹۵۲ء میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے یہاں کچھ عرصے ایڈورڈ کالج پشاور میں تعلیم حاصل کرتے رہے، پھر اسی سال کے آخر میں کراچی منتقل ہو گئے۔

جواں سال امان اللہ نے کراچی میں، لاکھوں سخت کوش مزدوروں اور فاقہ مست بیروزگاروں کی طرح مشقت اور محرومی کی زندگی گذاری۔ چھ ماہ تک ان کا یہ معمول رہا کہ دن بھر مزدوری کرتے اور رات کو فٹ پاتھ پر سو رہتے۔ بعد میں انہیں ایک کلرکی کی نوکری مل گئی، لیکن یہ روزگار بھی دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ چھ مہینے بعد وہ پھر بیروزگار اور سڑکوں پہ محنت مزدوری کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اب کے انہوں نے ایک خود کفیل طالب علم کی حیثیت سے تیس روپے کی جز وقتی ملازمت کے سہارے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی سال انہوں نے کشمیر سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی اور اس کی کراچی برانچ کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ یہ ۱۹۵۴ء کا ذکر ہے۔

امان اللہ خاں، ۱۹۵۰ء میں بی اے کرنے کے بعد مختلف سکولوں میں دو شفٹوں کے اندر پڑھاتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ریڈیو پاکستان کراچی میں عارضی ترجمان کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ان کی یہ زندگی پہلے کے مقابلے میں بظاہر کسی قدر فراغت اور اطمینان کی زندگی معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ان دنوں وہ ۱۵ گھنٹے یومیہ سے زیادہ کام کرتے تھے۔ دو شفٹوں میں پڑھاتے ہیں، پھر لا کے طالب علم کی حیثیت سے خود پڑھنے جاتے تھے۔ سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مصروفیات اس کے علاوہ تھیں۔

نظر بندی، رہائی اور نظر بندی

۱۹۶۱ء میں جناب امان اللہ خاں نے کراچی سے انگریزی میں ایک سیاسی ماہنامہ "دی وائس آف کشمیر" جاری کیا۔ بعض ناگزیر حالات کی بنا پر اسے ۱۹۶۳ء میں بند کرنا پڑا۔ یہ ماہنامہ جموں وکشمیر کی آزادی کے لئے حالات سازگار بنانے کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ بہرحال انہوں نے ۱۹۶۲ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کر لیا۔

۱۹۶۳ء میں جموں وکشمیر انڈیپنڈنٹس کمیٹی قائم کی گئی۔ تو امان اللہ خاں اس کے بانی ممبروں میں سے ایک تھے۔ یہ کمیٹی ریاست جموں وکشمیر کے لئے آزادی کا مطالبہ کرتی تھی۔ ۱۹۶۵ء میں جموں وکشمیر محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) قائم کیا گیا۔ اور جناب امان اللہ خاں اس کے پہلے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے اس محاذ میں وہ سب ممبر موجود تھے جو جموں وکشمیر انڈیپنڈنس کمیٹی میں شامل تھے۔ امان اللہ خاں اس کے سکریٹری جنرل کے عہدے پر نومبر ۱۹۶۹ء تک فائز رہے۔ اب وہ محاذ کے پبلسٹی بورڈ کے چیئرمین ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء میں تحفظ عوام افریقہ ایشیا میں کشمیر کمیٹی قائم کی اور اس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوتے۔

امان اللہ خاں کی نظربندی بھی اپنی نوعیت کا ایک اہم واقعہ ہے ۱۱ جنوری سے قبل، وہ گلگت ڈسٹرکٹ جیل میں تھے۔ ۱۲ جنوری کو گلگت میں فائرنگ کا المناک حادثہ رونما ہوا۔ مشتعل عوام نے جیل کی آہنی سلاخیں توڑ ڈالیں اور اپنے محبوب رہنماؤں کو باہر نکال لیا۔ ان میں نہ صرف امان اللہ خاں، بلکہ بعض دوسرے سیاسی رہنما بھی شامل تھے۔ جب اشتعال فرو ہو گیا تو امان اللہ خاں اور دوسرے رہنماؤں نے گلگت کی انتظامیہ کے سامنے اپنے آپ کو از خود پیش کر دیا۔ وہ ایک بہت بڑی جیل میں قید تھے، جس میں سات لاکھ عوام پہلے سے محبوس چلے آرہے ہیں، لہٰذا کسی چھوٹی قید سے کیوں ڈرتے! ان لوگوں کو دوبارہ جیل بھیج دیا گیا۔ یہ رہنما جو گلگت و بلتستان کے عوام کے لئے حق رائے دہی اور بنیادی انسانی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں، اب بھی نظر بند ہیں۔ یہ علاقہ، شاید اپنی مثال آپ ہے۔ جہاں بنیادی شہری اور انسانی حقوق کا مطالبہ، بغاوت قرار دیا جاتا ہے۔

گلگت جیل میں ان سیاسی قائدین کے پاس بستر تک موجود نہیں۔ یہ لوگ بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہیں۔ انہیں سگریٹ تک پینے کی اجازت نہیں۔ گلگت کی انتظامیہ اگر اور کچھ نہیں کر سکتی تو اپنے سیاسی قیدیوں کے ساتھ تو ایسا سلوک کرے، جو پاکستان کی دوسری جیلوں میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ اخلاقی مجرموں کی طرح، ان پر تشدد تو نہ کرے۔ حکومت سے ہمارا مطالبہ ہے کہ یا تو ان نظربندوں کو فوراً غیر مشروط طور پہ رہا کرے، یا کھلی عدالت میں، ان پر مقدمہ چلائے۔

روسی کتابوں کی نمائش میں چند شائقینِ کتب کے اجتماع کا منظر

کراچی میں روسی کتابوں کی نمائش

سب سے معیاری اور ارزاں کتابیں روس میں شائع ہوتی ہیں

روس میں ہر ایک منٹ میں ۵۰۰ ہزار کتابیں چھپتی ہیں، جبکہ ہر سال کتابوں کی ۱۳۰۰ میلین کاپیاں تیار ہوتی ہیں۔ روسی اور غیر ملکی مصنفین کی تخلیقات ۸۹ زبانوں میں اور ۴۵ غیر ملکی زبانوں میں کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ لینن کی تصانیف کی ۳۸۲ ملین کاپیاں، مارکس اور انجیلز کی ۸۰ میلین کاپیاں، لیوٹالسٹائی کی ۱۱۸ ملین کاپیاں، پشکن کی ۱۱۱ ملین کاپیاں، گورکی کی ۱۰۶ میلین کاپیاں، چیخوف کی ۶۸۰۵ میلین کاپیاں، شولوخوف کی ۴۳ میلین کاپیاں، بالزاک کی ۲۰۶ میلین کاپیاں، چارلس ڈکن کی ۲۰ میلین کاپیاں، شیکسپیئر کی ۵۰۷ میلین کاپیاں اور رابندرناتھ ٹیگور کی ۴۰۵ میلین کاپیاں شائع ہو چکی ہیں۔

سوویت یونین میں رسائل ۵۸ زبانوں میں شائع ہوتے ہیں ان میں سے ۴۴ زبانیں سوویتی عوام کی ہیں اور ۱۴ غیر ملکی زبانیں ہوتی ہیں۔ اخبارات اور رسائل کی ۲۲۰ میلین کاپیاں شائع ہوتی ہیں۔ اخبارات کی سالانہ اشاعت ۲۳۱۰۰ میلین اور رسائل کی ۱۵۰۰ میلین ہے۔ ۱۹۱۳ء میں صرف دو اخبارات تھے اور ہر ۱۰۰ سوویتی باشندوں کے لئے ۶۲ کتابیں تھیں، جبکہ ۱۹۶۵ء میں ۴۵ اخبارات، ۳۷ میگزین اور ہر ۱۰۰ سوویتی شہری کے لئے ۵۵۰ کتابیں ہو گئیں۔ سوویت یونین میں ۳۷۰۰۰۰ لائبریری ہیں، جن میں ۲۳۰۰ میلین کتابیں اور میگزین ہیں۔ ہر شہری بلا امتیاز ان لائبریریوں کا رکن بن سکتا ہے، رکنیت سازی کے لئے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ لائبریریوں کے اخراجات اسٹیٹ فنڈ سے پورے کئے جاتے ہیں۔ فیکٹری اور فارم لائبریریوں کی دیکھ بھال ٹریڈ یونین کرتی ہیں۔ سوویت یونین ہر شہری کو لائبریری کی ۱۰۰ کتابیں فراہم کی جاتی ہیں جبکہ امریکہ میں ہر گیارہ افراد پر ۱۰۰ کتابیں آتی ہیں۔ سوویت یونین کی سب سے بڑی لائبریری لینن اسٹیٹ لائبریری (ماسکو) ہے۔

روسی کتابیں، دنیا بھر کی کتابوں سے سستی اور کم قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے روسی کتابوں کی اشاعت، دوسری زبانوں کی کتابوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں روسی کتابوں کی مانگ دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک روسی کتاب "سائنس اور مین کائنڈ" کی ۱۰۰۰۰۰ کاپیاں شائع ہوئیں جو ایک روبل اور ۶۰ کوپیکس میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ اسی طرح آرٹ کی بین الاقوامی تاریخ کی ۸ جلدیں شائع ہوئیں، ہر جلد کی قیمت ۸ روبل تھی۔ یہ کتاب سوویت یونین کی مہنگی ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، لیکن بین الاقوامی مارکیٹ کے لحاظ سے اس کتاب کی قیمت بہت کم تھی اور اس کی تقریباً ۶۵۰۰۰ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ ۲۵ روبل سے زیادہ قیمت کی کتابوں کو اقساط میں خریدنے کی سہولت بھی مہیا کی گئی ہے۔

سوویت یونین میں ناخواندگی ختم ہو چکی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ۲۱۰۰۰۰ اسکول تھے جن میں ۴۸۲۰۰۰۰ طالب علم زیر تعلیم تھے۔ خصوصی سیکنڈری اسکولوں کی تعداد ۴۰۰۰ یونیورسٹی اور کالج ۷۶۰ تھے جن میں ۴۱۰۰۰۰ طالب علم پڑھتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں آٹھ سالہ لازمی تعلیمی نظام نافذ کیا گیا تھا۔

سوویت یونین میں فنکاروں کو آزادی تحریر کی مکمل آزادی ہے۔ البتہ کتابوں پر پابندی عائد کی جاتی ہے، جو جنگ، نسلی امتیاز مذہبی تعصب، جرائم، جنس اور ہوس پرستی کو ہوا دیتی ہیں۔

میکسم گورکی سوویت ادب کے پہلے ممتاز رہنما تسلیم کئے جاتے ہیں۔ پاکستان کی اردو اور بنگالی زبانوں میں ان کی بیشتر تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ الیکسی ٹالسٹائی کی کتاب "جنگ اور امن" اور مائیکل شولوخوف کا ناول "اور ڈان بہتا رہا" کا شمار دنیا کی عظیم ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کے مقبول مصنف نکولائی اوستروفسکی کی کتاب "ہاؤ دی اسٹیل واز ٹمپرڈ" کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔ ان کی کتاب نے دنیا بھر میں غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ اور اب تک تقریباً ۵۵ زبانوں میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہے۔ سوویت یونین میں سب سے زیادہ شہرت یوکاکیو، سعدی، شیلے، شیکسپیئر، گوئٹے، ژولا، عباس، موپاساں، رومارولاں کو حاصل ہوئی ہے۔

پاکستان میں سوویت یونین کی کتابیں بھی روز بروز مقبول ہوتی جا رہی ہیں۔ چونکہ روسی کتابیں عام طور پر سستی اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے انتہائی دیدہ زیب اور نفیس ہوتی ہیں۔ اس لئے آسانی سے لوگوں کی توجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ تین سال قبل پاکستان میں روسی کتابوں کے درآمد کنندگان مشکل سے دو یا تین تھے، جبکہ ان دنوں ان کی تعداد بڑھ کر ۳۰ ہو گئی ہے۔ سوویت پبلشرز پاکستان کے عوام کے مزاج اور پسند کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

این ایس ایف کے امیدوار یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ اور اساتذہ کے مطالبات کے حامی ہیں



اشفاق حسین توفیق

"میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے شروع ہی سے متاثر تھا اشتراک و تعاون بھی جاری تھا۔ ۱۹۶۸ء میں این ایس ایف نے ایوب آمریت کے خلاف ایک ہمہ گیر تحریک شروع کی۔ طلبا کی جائز آواز دبانے کے لئے حکومت کے تمام کل پرزے برہنہ تلوار بن گئے۔ پورا ملک ایک بڑی جیل میں تبدیل ہو گیا۔ میں این ایس ایف کی اس ملک گیر تحریک میں بحیثیت ایک کارکن شامل تھا۔" یہ الفاظ مسٹر اشفاق حسین توفیق کے ہیں۔ جو کراچی یونیورسٹی میں یونین کی صدارت کے لئے این ایس ایف کے امیدوار ہیں۔

مسٹر اشفاق حسین توفیق کیمسٹری آنرز سال دوم کے طالب ہیں۔ امتحانات میں ہمیشہ امتیاز سے کامیاب ہوتے آئے ہیں۔ ان کا شمار یونیورسٹی کے ہونہار طلبا میں ہوتا ہے۔ وہ ملکی معاملات خصوصاً معاشی اور سیاسی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ طلبا کے موجودہ تعلیمی مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اور اس بات پر مکمل یقین رکھتے ہیں کہ جب تک موجودہ تعلیمی اور معاشی ڈھانچے کو تبدیل نہیں کیا جاتا طلبا آسودہ خاطر نہ ہوں گے۔ اور ان کے اندر بے چینی اور بے اطمینانی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے گی۔

مسٹر اشفاق حسین توفیق نے بتایا کہ تعلیمی سطح پر کراچی یونیورسٹی کے طلبا کے مسائل دور کرنے کے لئے این ایس ایف کے پاس ایک مبسوط اور جامع پروگرام ہے۔ اگر اس پروگرام پر عمل کیا گیا۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ طلبا کے مسائل کسی حد تک ختم نہ ہو جائیں۔ انہوں نے بتایا کہ امسال یونیورسٹی کے انتخابات پروگرام کی بنیاد پر ہوں گے۔ اور وہ اپنی انتخابی مہم کے دوران طلبا کو اپنا پروگرام برابر پیش کر رہے ہیں۔ جس میں بنیادی باتیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ وائس چانسلر کے مسلط کردہ غیر جمہوری دستور کی تنسیخ اس کی جگہ نئے دستور کی تدوین اور عام اجلاس سے اس کی منظوری۔ واضح رہے کہ ۱۹۶۷ء میں وائس چانسلر نے یونیورسٹی یونین کے جمہوری آئین کو کالعدم قرار دے کر ایک نام نہاد بی ڈی دستور مسلط کر دیا تھا۔ اور جس کی منظوری آج تک طلبا کے عام اجلاس سے نہیں لی گئی۔

۲۔ موجودہ تعلیمی ڈھانچے میں بنیادی اور انقلابی تبدیلی کے لئے جدوجہد اور اس کی جگہ "سمسٹر سسٹم" کا نفاذ

۳۔ ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرانا، ۵ سال قبل یونیورسٹی کو ۳۲ بسیں ملی تھیں۔ مگر ناکارہ انتظام کی وجہ سے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ الجھتا چلا گیا۔ ان بسوں کو یونین کے تحت چلایا جائے گا پنجاب اور پشاور یونیورسٹی کی بسیں یونین کے تحت چلائی جاتی ہیں۔ اور وہاں طلبا کو ٹرانسپورٹ کی بہتر سہولت حاصل ہے۔

۴۔ یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ اور یونیورسٹی کوڈ میں تبدیلی کی کوشش۔ اساتذہ کے مطالبات کی بھرپور حمایت۔

۵۔ اس امر کی کوشش کہ سنڈیکیٹ کے ارکان جمہوری طریقے سے منتخب کئے جائیں۔ سنڈیکیٹ کے ارکان کو وائس چانسلر کے انتخاب کا حق دیا جائے۔

۶۔ ڈاؤ میڈیکل کالج کے طرز پر یونیورسٹی میں لینڈنگ لائبریری کے قیام کی جدوجہد۔ فنڈ کے ذریعہ کتابوں کی کمی دور کی جائے گی۔ بیرونی ممالک کی لائبریریوں سے رابطہ قائم کیا جائے گا اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ وہ یونیورسٹی میں اپنی لائبریری کی ایک شاخ قائم کرنے پر رضامند ہو جائیں۔

۷۔ پراکٹوریل سسٹم کو ختم کر دیا جائے گا۔ اور اس کی جگہ طلبا میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کے فرائض فیکلٹی کے نمائندوں کو دے دیئے جائیں گے۔

۸۔ یونیورسٹی کی ریکایاتی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے گا۔ مختلف نظریات رکھنے والے سیاسی رہنماؤں کو مدعو کیا جائے گا۔ اور ماضی کی طرح صرف ایک مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے لیڈروں کو بلانے کی جو غلط روایت قائم کی گئی ہے اسے ہر قیمت پر ختم کر دیا جائے گا۔

۹۔ ہوسٹل کے مسائل حل کئے جائیں گے۔ ہوسٹل کے موجودہ نرخ میں کمی کرانے کی جدوجہد کی جائے گی۔

۱۰۔ یونیورسٹی کونسل میں غیر ملکی طلبا کو نمائندگی دلائی جائے گی۔ کراچی یونیورسٹی فارن اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کو یونیورسٹی سے تسلیم کرانا اور اس تنظیم کو مالی امداد دلانے کے لئے بھرپور جدوجہد کی جائے گی۔



نجم الہدیٰ، جنرل سیکریٹری شپ کے امیدوار

نجم الہدیٰ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ علم الاقتصادیات سال دوم کے طالب علم ہیں، نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پرانے اور سرگرم کارکن ہیں۔ اس سال یونیورسٹی کی یونین کے الیکشن میں جنرل سیکریٹری کے عہدے کے امیدوار ہیں۔ طلباء میں اچھی شہرت رکھتے ہیں اور ان کے متعلق ایک عام تاثر پایا جاتا ہے کہ "یہ انتخاب جیت لیں گے"۔

انہوں نے بتایا کہ وائس چانسلر سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کوئی نیا مطالبہ نہیں ہے۔ اس سے قبل این ایس ایف ۱۹۶۸ء میں یہ مطالبہ کر چکی ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وائس چانسلر کے پاس طلبا اور اساتذہ کی آواز سننے والے کان اور جاگنے والا ضمیر موجود نہیں ہے۔ مگر وہ کب تک اساتذہ اور طلبا کی جائز آواز دبا سکیں گے۔ آخر وہ کب تک ہیں اپنی جدید ترین محلات ڈھہ جائیں گے اور وہ اپنی تمام بے انصافیوں سمیت عوام کی عدالت میں کھڑے ہوں گے۔

مسٹر نجم الہدیٰ نے کہا کہ "اس بار الیکشن میں این ایس ایف کی کامیابی یقینی ہے۔ یونیورسٹی کے طلبا کے گھٹے ہوئے جذبات پھٹ پڑنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ یونیورسٹی کی تعلیمی فضا کو تعلیمی رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ یونیورسٹی کو جماعت اسلامی کی سرگرمیوں اور نوکر شاہی کی سازشوں سے نجات دلانے کے لئے کمربستہ ہیں۔ اور اس الیکشن میں وہ اپنے نیک عزائم ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتے ہیں۔ طلبا چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی ایک خود مختار ادارہ بنے۔ سنڈیکیٹ میں طلبا، اساتذہ اور شہریوں کو نمائندگی دی جائے۔ وائس چانسلر کو سنڈیکیٹ کے نمائندے منتخب کریں۔ یونین کے لئے قابل قبول دستور تیار کیا جائے اور عام اجلاس سے اس کی منظوری لی جائے۔ بسوں کا پرابلم حل ہو، ہوسٹل کے مسائل ختم ہوں، یونیورسٹی آرڈیننس منسوخ ہو، فیسوں میں کمی کی جائے۔ یونیورسٹی کے طلبا ایک عرصے سے مسائل کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ اب وہ مزید جہنم کا ایندھن نہیں بنیں گے۔ انتخاب میں کامیابی کے بعد ہم فوری طور پر ان مسائل کی جانب توجہ دیں گے

بھٹو اور مجیب کے درمیان، سیاسی اور فکری رشتہ سوشلزم کا ہے

جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہم اس واقعہ پر کسی قسم کا تبصرہ کئے بغیر صرف مشرقی پاکستان کے ردِ عمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ عوامی لیگ کے ایک ترجمان کے مطابق بھارتی طیارے کا اغوا اور اس کی تباہی کا واقعہ ایک ایسے موقعہ پر رونما ہوا ہے جب عوامی لیگ کی جانب سے قومی اسمبلی کا اجلاس ۱۵ر فروری کو بلانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ لیکن اس واقع کے بعد صورتِ حال کو جس طرح الجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس سے یہ خدشہ لاحق ہو رہا ہے کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں مزید تاخیر ہوگی جو کسی صورت میں بھی مشرقی پاکستان کے عوام کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ عوامی لیگ کے اس ترجمان کے مطابق ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت نے مسئلہ کشمیر کو کبھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور اس پارٹی نے انتخاب سے قبل اپنا منشور عوام کے سامنے پیش کیا تھا اس میں بڑی وضاحت سے اس متنازعہ مسئلہ کے حل پر زور دیا ہے لہٰذا عوامی لیگ کو یہ موقع فراہم کئے بغیر کہ وہ دستور سازی اور عوامی حکومت کے قیام کے بعد اس مسئلہ کو حل کرنے کی طرف توجہ دیتی۔ ملک میں ایک ایسی صورت حال پیدا کر دینا جو مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنادے اور مستقبل کی عوامی حکومت کے لئے مزید مسئلے کھڑے کر دے۔ دانشمندی اور سیاسی حکمتِ عملی کے منافی ہے

طیارے کے اغوا پر عوامی لیگ کا ردِ عمل

طیارے کے اغوا اور اس کی تباہی پر عوامی لیگ کے ردِ عمل کے برعکس سنجیدہ سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ ماضی میں مشرقی پاکستان کے عوام کا نہ صرف یہ کہ ملک کے مٹھی بھر مفاد پرستوں، اجارہ دار سرمایہ داروں اور سامراجی ایجنٹوں نے جی بھر کر استحصال کیا بلکہ ان کے اور مغربی پاکستان کے عوام کے درمیان نفرت اور عداوت کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے ۲۳ سال تک وہ اپنے سیاسی گماشتوں اور نام نہاد اسلام پسندوں کو بھی استعمال کرتے رہے۔ سیاسی رہنماؤں، عوامی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کے لبادے میں یہ سامراجی اور مفاد پرست ایجنٹ ۲۳ سال تک مغربی اور مشرقی بازو کے مظلوم عوام کے فکری اتحاد پر ڈاکہ ڈالتے رہے یہی مفاد پرست ٹولہ آج بھی اپنی کوششوں میں سرگرم ہے اور آج نہ صرف ایک مسئلہ کشمیر بلکہ ملک کو درپیش تمام بنیادی اور کلیدی مسائل کو دونوں بازوں میں الجھانے کی کوشش کی جارہی ہے اور دونوں بازوؤں کے عوام کے سامنے صورت حال کی الگ الگ تعبیریں پیش کی جارہی ہیں۔ چنانچہ کونسل مسلم لیگ، جمعیت العلمائے پاکستان (سیالوی گروپ)، جماعت اسلامی اور اس قسم کی دوسری جماعتیں اور ان کے نمائندے اپنی سیاسی بقا کی خاطر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں ایک بار پھر دورخی پالیسی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

کونسل مسلم لیگ کے رہنما ریٹائرڈ ایئر مارشل نور خاں نے مغربی پاکستان میں کشمیری حریت پسندوں کے اقدام پر جس ردِ عمل کا اظہار کیا ہے اس کے برعکس ڈھاکہ میں سردار شوکت حیات خاں نے اس اقدام کو "جنگی ہسٹیریا" سے تعبیر کیا ہے۔

اسلام پسند کیا کہتے ہیں!

جمعیت العلمائے پاکستان (سیالوی گروپ) کے مولانا شاہ احمد نورانی نے ڈھاکہ میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے "انکشاف" کیا کہ کچھ اشتراکی عناصر جو خاص طور پر مغربی پاکستان میں سرگرمِ عمل ہیں اقتدار کی پرامن منتقلی کے خلاف ہیں۔" انہی مولانا نے "اسلامی سوشلزم" کے بارے میں فرمایا کہ اس کی آڑ میں اشتراکی عناصر کام کر رہے ہیں۔ لیکن جب "سوشلزم" کی حامی عوامی لیگ کی بات آئی تو انہوں نے فرمایا کہ "میرے اور عوامی لیگ کے سربراہ کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہے۔" انہوں نے جناب بھٹو پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ان کی پارٹی کو "قادیانیوں کی حمایت حاصل ہے" اور یہ کہا کہ "قادیانیوں کی ایک شاخ تل ابیب میں بھی قائم ہے۔"

اسی طرح جماعت اسلامی کی حامی طلباء تنظیم "اسلامی جمعیت طلباء" کے نئے صدر جناب مطیع الرحمٰن نظامی نے ۳ر فروری کو ڈھاکہ کے رمنا ریسٹورنٹ میں ایک پریس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ "بھارتی طیارہ اغوا کرنے والوں کا تعلق جموں کشمیر قومی محاذِ آزادی" سے نہیں ہے اور وہ لوگ غلط طور پر اپنے آپ کو اس تنظیم کے ارکان بتاتے ہیں۔ "اسلامی جمعیت طلباء" کے صدر نے اسی پریس کانفرنس میں بھارتی طیارے کے اغوا کی مذمت کرتے ہوئے اس واقعہ کو جمہوریت کی بحالی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا۔

اس صورت حال کے پس منظر میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جمہوریت کی بحالی کے نام پر ماضی میں جمہوریت اور عوام دشمنی کے مرتکب افراد اور طبقے آج بھی مشرقی اور مغربی بازو کے درمیان غلط فہمی اور شکوک وشبہات پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس کوشش میں انہوں نے اپنی ساری توجہ اور حمایت عوامی لیگ کی طرف منتقل کر دی ہے۔ لیکن عوامی لیگ کی مرکزی قیادت بھی یہ اچھی طرح محسوس کرتی ہے کہ ان کی حمایت "خلوص اور عوام دوستی پر نہیں بلکہ "بغضِ بھٹو" پر مبنی ہے۔ کیوں کہ بھٹو اور مجیب کی سیاسی پارٹیوں کے درمیان یا الفاظِ دیگر مغربی اور مشرقی بازو کے درمیان حالیہ قومی انتخابات کے بعد اگر کوئی مشترک سیاسی اور فکری رشتہ اجاگر ہوا ہے تو وہ "سوشلزم" ہے اور یہ سامراجی ایجنٹ لفظ سوشلزم ہی کو اپنے لئے موت کا پروانہ سمجھتے ہیں۔

"سیاسی سمجھوتہ"

ان حالات میں اب دیکھنا یہ ہے کہ عوامی لیگ کے اہم لیڈر، قومی وصوبائی اسمبلی کے اراکین اور صوبائی وقومی مجلس عاملہ جب ۱۴ر فروری سے ملک کو درپیش موجودہ سیاسی اور اقتصادی اور دستوری مسائل پر غور وخوض کا آغاز کرے گی تو کیا وہ جمہوریت کی بحالی کے نام پر اس حد تک جھک جائے گی کہ ماضی میں ملک کے دونوں بازوؤں کے عوام کے فکری اتحاد پر ڈاکہ ڈالنے اور عوام دشمن کردار ادا کرنے والوں سے "سیاسی سمجھوتہ" کرلے؟ یا پھر مستحکم، عوام دوست اور دیرپا جمہوریت کے قیام کی خاطر ان سیاسی رہنماؤں کا اشتراک وتعاون حاصل کرے گی۔ جو عوامی لیگ ہی کی طرح "عوام دوستی" کے باعث گذشتہ ۲۳ سال کے دوران سامراج اور اس کے ایجنٹوں کے عتاب کا شکار ہوئے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات کے لئے ہمیں عوامی لیگ کے ان فیصلوں کا انتظار کرنا ہوگا جو وہ اپنے ۱۴ر اور ۱۵ر فروری کے اجلاس میں کریگی۔



ہماری منزل سائنٹفک سوشلزم ہے

قومی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابی نتائج کا تجزیہ لیل و نہار کے بعض مضامین میں اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا مختلف سیاسی پارٹیوں کی طاقت کا اصل پیمانہ ان کی حاصل کردہ نشستیں ہی ہیں یہ ایک سطحی قسم کا تجزیہ ہے۔ صحیح تجزیے کے لئے پارٹیوں کی حاصل کردہ نشستوں کے علاوہ ان کی حکمتِ عملی کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔

مثال کے طور ملک کی دونوں کامیاب سیاسی پارٹیوں نے یعنی عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی نے صرف الیکشن جیتنے کے لئے اپنے اصولوں کو ترک کر کے موقع پرستی سے کام لیا۔ چنانچہ مجیب الرحمٰن صاحب نے مشرقی پاکستان کے عوام کی بدحالی کا سبب سرمایہ داری، جاگیرداری اور نوکر شاہی کو گردانتے کی بجائے پورے مغربی پاکستان کو مورد الزام ٹھہرایا لیکن الیکشن کے فوراً بعد بنگلہ دیش کا نعرہ ترک کر کے پاکستان زندہ باد کا نعرہ اختیار کر لیا۔ بھٹو صاحب الیکشن سے پہلے تو سوشلزم کا نعرہ لگاتے تھے لیکن الیکشن کے فوراً بعد آپ نے اعلان فرمایا کہ کمیونزم کے خلاف امریکہ نے جو محاذ بنایا ہے۔ وہ اس معاملے میں امریکہ سے بھی آگے ہیں (واضح ہو کہ کمیونزم ابھی دنیا کے کسی ملک میں بھی موجود نہیں اور امریکہ کا محاذ سوشلزم ہی کے خلاف ہے۔)

میرا مقصد یہ دو مثالیں پیش کر کے مذکورہ پارٹیوں کو بدنام کرنا نہیں ہے بلکہ اس قانونِ فطرت کا اظہار ہے کہ موقع پرست سیاسی پارٹیوں کی طاقت زیادہ پائیدار نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جن پارٹیوں کا پروگرام مظلوم طبقات کی صحیح رہنمائی کرتا ہے بالآخر عوام انہی پارٹیوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ مثلاً شیخ مجیب الرحمٰن صاحب کے چھ نکات میں صرف قومی سرمایہ داروں کے حقوق کا تحفظ کیا گیا ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ لہٰذا عوامی لیگ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق سے غفلت برت کر زیادہ عرصہ برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتی۔ اور بھٹو صاحب جو اپنی پارٹی کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں ملک میں سوشلزم لانا چاہتے ہیں، میرے نزدیک ان کی یہ مژدہ سرائی قوم کے لیے طفل تسلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مسائل کا حل سائنٹفک سوشلزم ہے نہ کہ نام نہاد اسلامی سوشلزم۔ اور سائنٹفک سوشلزم کی منزل تک پہنچنے کے لئے قوم کو ایک طویل اور منظم جدوجہد سے گذرنے کی ضرورت ہے اور حالات یہ ہیں کہ ابھی ہمیں جدوجہد کرنے کی آزادی بھی نصیب نہیں لہٰذا سب سے پہلے ہمیں جمہوری آزادی کی ضرورت ہے تب کہیں جاکہ ہم سائنٹفک سوشلزم کا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اب ۲۳ سال بعد خدا خدا کر کے جمہوری آزادی ملنے کی امید پیدا ہوئی ہے اور توقع ہوئی ہے کہ مارشل لا ریگولیشنوں اور سیفٹی اور سکیورٹی ایکٹوں سے نجات حاصل کر کے ہم سائنٹفک سوشلزم کے لئے جدوجہد شروع کر سکیں گے، جس جدوجہد کی رہنمائی ملک کے مزدور کسان اور دانشور کریں گے۔ آخری فتح سائنٹفک سوشلزم کی ہوگی نہ کہ وڈیروں کے لائے ہوئے "اسلامی سوشلزم" کی۔

سہیل اختر۔ لیاقت کالونی
حیدرآباد

سندھ کی سرکاری زبان، سندھی ہوگی

آپ کے نمائندہ خصوصی نے یکم فروری کے شمارے میں زبان کے مسئلہ پر جو رپورٹ حیدرآباد سے پیش کی ہے وہ سراسر جانبداری پر مبنی ہے۔

سندھ یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے جو قرارداد منظور کی ہے وہ حق و انصاف پر مبنی ہے ون یونٹ سے پہلے سندھی زبان سندھ یونیورسٹی کی کاروباری اور اندرونی خط و خطابت کی زبان تھی لیکن ون یونٹ کے بعد ایک منظم سازش کے تحت سندھی زبان کو نظرانداز کر کے آہستہ آہستہ اس کی جگہ اردو زبان کو مسلط کر دیا گیا۔ آج کل ہر آدمی ترقی پسندی اور سوشلزم کا دعویٰ دار بنا پھرتا ہے۔ یہ کہاں کی ترقی پسندی ہے کہ نواب مظفر جیسے متعصب آدمی کی تحریک کی ظاہری مخالفت اور اندرونی حمایت کر کے سندھی زبان کے خلاف صفحہ کے صفحہ سیاہ کئے جائیں یہ کہاں کا سوشلزم ہے کہ سندھ کی پانچ ہزار سالہ پرانی زبان کے ساتھ ایک نئی زبان کو درآمد کر کے اس کو سندھی زبان کے ساتھ کا درجہ دے دیا جائے۔ سندھ میں صرف سندھی زبان کو سندھی کی سرکاری اور دفتری زبان بنانے کا حق حاصل ہے جو لوگ قوموں کا حق خود اختیاری تسلیم نہیں کرتے اور علاقائی زبان اور ثقافت کی ظاہری حمایت اور درپردہ مخالفت کرتے ہیں وہ ہرگز ترقی پسند اور اشتراکی نہیں کہلائے جا سکتے۔

(فاجہ یار محمد یار، ٹنڈو محمد خان)

یہ محض ناکام سیاستدانوں کی سازش

لیل و نہار ۳۱ جنوری میں آپ نے کچھ "اردو سندھی تنازعہ" پر اظہار خیال کیا ہے اور اس کا الزام "پٹے ہوئے سیاستدانوں" پر ڈال کر مسئلہ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ اس مضمون پر کسی مصنف کا نام تحریر نہیں تو کیا یہ سمجھا جائے کہ یہ ادارہ کا اپنا سرکاری "موقف ہے"؟

پچھلے چند دنوں کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں جسے چند پٹے ہوئے سیاستدانوں کا شوشہ" سمجھ کر نظرانداز کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں چند نام نہاد ترقی پسند افراد کا ذکر بھی کروں گا۔ جو سندھی رائج کرنے کے لئے حیدرآباد بورڈ کے فیصلے پر تو خاموش ہیں، البتہ اردو کے حامیوں کے "تشدد پسند" رویّہ پر معترض ہیں اور مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ خاموش تماشائی بنے رہیں، اور اردو کو "غیر ملکی زبان" "اقلیتی زبان" اور اس طرح کی دوسری کوششوں کو برداشت کر لیں۔ شیخ ایاز صاحب نے اردو کو "لاجستھانی پنجابی اور پشتو" کے برابر درجہ عطا فرمایا ہے اور سندھ کی "اقلیتی زبانوں" میں اس کا شمار کیا ہے۔ جب کہ اردو بولنے والوں کی آبادی سندھ میں تقریباً نصف ہے اور اردو سمجھنے والوں کی تعداد تقریباً سو فیصدی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی کو رابطہ کی زبان" قرار دیا ہے۔ اور اس طرح بالواسطہ طور پر اس کی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنے کی حمایت کی ہے۔ کیا یہ تمام لن ترانیاں قابل گرفت و مذمت نہیں ہیں کیا ان حضرات سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ اردو کی نہ صرف صوبائی بلکہ قومی حیثیت سے انکار کر کے اور انگریزی کی بالواسطہ حمایت کر کے کونسی خدمت انجام دے رہے ہیں پیپلز پارٹی کے متعدد رہنماؤں کی تقریروں سے بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ وہ اردو دشمنی میں جی ایم سید گروپ سے کسی طرح کم نہیں مثلاً جشن رئیس امروہوی میں رسول بخش تالپور کا یہ مشورہ کہ اردو کے حامی "ہنگامے نہ کریں اور مفاہمت" کے ذریعے لسانی مسئلہ کا حل تلاش کریں جب کہ حیدرآباد بورڈ کے فیصلوں پر انہوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ حاکم علی زرداری کا بیان بھی اخبارات میں چھپا ہے جس میں انہوں نے اردو کو "غیر ملکی" زبان قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس زبان کو قوم کے بانیوں نے "قومی زبان" کا درجہ دیا ہو۔ اور جو سندھ میں آباد نصف آبادی کی مادری زبان ہو گیا اُسے "غیر ملکی زبان" قرار دینے والے کی صحت اور نیت دونوں مشکوک نہیں؟ ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ سندھی کو پوری سندھی آبادی پر تھوپنے کی کوشش بالواسطہ طور پر نہایت چالاکی کے ساتھ سندھی انتہا پسندوں کی آڑ لے کر کر رہے ہیں۔

(عبدالستار شیخ۔ کراچی)

مزدور انجمنیں ۱۶ فروری کے اجلاس میں تالہ بندی اور ہڑتال کے مسائل پر غور کرینگی

۱۳ فروری کو مزدور آفس کورنگی میں مختلف ٹریڈ یونینوں کے رہنماؤں کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مزدوروں کے مسائل پر غور کیا گیا۔ جلسہ میں مزدور آفس کورنگی سے ملحق دس ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں کے علاوہ ویسٹ پاکستان ورکرز فیڈریشن کے سیکریٹری جنرل نبی احمد، جناب علی امجد ایڈوکیٹ، محترمہ تاج بی بی بلوچ سیکریٹری پریس کے محمد یامین اور فضل الرحمٰن، غوث علی وغیرہ نے شرکت کی۔ اعزاز نظیر نے صدارت کی۔

جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے جناب نبی احمد نے کہا مزدوروں میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری، مہنگائی اور تالہ بندی وغیرہ مزدوروں کے خلاف سرمایہ داروں کی ایک منظم سازش کا نتیجہ ہے انہوں نے مزدوروں کو تلقین کی کہ وہ کسی مسئلہ پر مشتعل ہوئے بغیر اپنے آپ کو منظم کرنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے انتخابات میں کامیاب ہونے والے ارکان سے مطالبہ کیا کہ وہ مزدوروں کے مسائل کی طرف توجہ دیں۔

مسٹر علی امجد ایڈوکیٹ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کراچی جیسے صنعتی شہر میں مزدوروں کے مسائل طے کرنے کیلئے صرف ایک جج کو مقرر کیا گیا ہے۔ موصوف نے کہا کہ طبقاتی شعور کی پختگی کے بغیر مزدوروں کے مسائل حل نہیں ہوسکتے۔

مس تاج بی بی بلوچ نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اس میں خواتین شریک نہ ہوں۔ خواتین کو مزدور تحریک میں کھُل کر حصہ لینا چاہیئے۔

سیکیوریٹی پرنٹنگ پریس ایمپلائیز یونین کے جنرل سکریٹری محمد یامین نے کراچی میں دفعہ ۱۴۴ کے مسلسل نفاذ کو مزدور تنظیم میں رکاوٹ ڈالنے کی ایک سازش قرار دیتے ہوئے کہا کہ مارشل لاء کی موجودگی میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کرکے قانون کو مذاق بنا دیا گیا ہے۔ مسٹر یامین نے ان عناصر کی سخت مذمت کی جو لسانی اور مذہبی جھگڑوں کو ہوا دے کر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک بار پھر ملک میں غیر یقینی صورت حال پیدا کرنا چاہ رہے ہیں۔

مزدور آفس کے مسٹر غوث علی نے مطالبہ کیا کہ حکومت داداموتی سنگھ، نازش امروہوی اور سلام بخاری کے وارنٹ گرفتاری منسوخ کرے۔ ڈاکٹر اعزاز نظیر جو علالت کی وجہ سے تقریر نہ کرسکے تھے۔ چند الفاظ میں مزدوروں کو اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ جلسے کے آخر میں ایک قرارداد کے ذریعہ دفعہ ۱۴۴ کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور گرفتار شدہ مزدوروں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

۱۶ فروری کو کراچی کی تمام مزدور انجمنوں اور سیاسی جماعتوں کا ایک اجلاس بلایا جائے گا جس میں مزدوروں کے تمام مسائل خصوصاً تالہ بندی، ہڑتال اور دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ پر غور کیا جائے گا۔

پاک، کوریا سوسائٹی

عوامی جمہوریہ کوریا اور پاکستان کے درمیان تہذیبی اور دوستانہ تعلقات بڑھانے اور ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے کی غرض سے پاک کورین یوتھ فرینڈشپ اور کلچرل سوسائٹی قائم کی گئی ہے جس کے مندرجہ ذیل ارکان چنے گئے ہیں۔

صدر ۔	ایم الیاس
نائب صدر ۔	مس گلنار سعید
جنرل سیکریٹری	عبدالحفیظ
خزانچی ۔	محمد علی
سیکریٹری نشرواشاعت ۔	مس زلیخہ واحد
جوائنٹ سیکریٹری ۔	مس فاطمہ لقمان

ارکانِ مجلسِ عاملہ

۱ ۔ مس عتیق باقر ۔
۲ ۔ سیف اللہ خاں
۳ ۔ جگدیش کمار
۴ ۔ عباس باقر
۵ ۔ شاہد خلیل
۶ ۔ نعیم الدین
۷ ۔ نعیم شیخ
۸ ۔ حافظ جعفری

میرزا غالب کی انسان دوستی

(صفحہ ۱۱ سے آگے)

بلاشبہ میں گدا ہوں اور نسلاً ترک ہوں، سلجوقیوں کے خاندان سے میرا تعلق ہے میں جب تک اپنا دسترخوان خوب پھیلا کر نہ بچھالوں، کھانا نہیں کھاتا۔

سلجوقیوں میں سے طغرل، الپ ارسلان اور ملک شاہ کی فتوحات اور نظام الملک طوسی کے دور وزارت میں سلطنت کے انتظام کی داستانیں تاریخ کے صفحات کی زینت ہیں۔ خدا جانے آج بھی انہیں کوئی قابل وقعت سمجھتا ہے یا نہیں لیکن میرزا غالب نے سلجوقی خاندان کی جو خصوصیت اس شعر میں بیان کردی ہے، یعنی کھانا کھانے کے وقت دسترخوان پھیلا کر بچھانا یہ اس وقت تک سلجوقیوں کے سلطانی جاہ وجلال سے درخشاں تر رہے گی جب تک یہ کائنات اور میرزا کا فارسی کلام باقی ہے۔

آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک مرقع میرزا نے خود نواب علاؤالدین خاں علائی کے نام ایک مکتوب میں پیش کردیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اگرچہ یک فنہ ہوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم ونثر کی داد بہ اندازہ بالیست پائی نہیں، آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا، قلندری وآزادگی وایثار وکرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں، بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکا لو اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہوسکے تو نہ سہی، جس شہر میں رہوں، اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔"

یہ میرزا غالب کی انسان دوستی کی چند جھلکیاں تھیں جو آپ کے سامنے پیش کردیں۔ اصل موضوع بہت وسیع تھا اور اس کے لئے بہت زیادہ شواہد میرزا کے اردو اور فارسی کلام میں موجود ہیں منتظمین تقریب نے مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی، لیکن خود مجھے مناسب معلوم نہ ہوا کہ آپ حضرات کو زیادہ زحمت دوں۔ دلی خلوص کے ساتھ آپ کے لطف وکرم اور نوازش کا شکر گزار ہوں۔ آرزو ہے کہ آپ میرزا غالب کے کلام پڑھیں اور دیکھیں کہ اس گنجینے میں کیسے کیسے بے بہا گوہر ہیں۔ میرزا نے جب کہا تھا کہ:

بادبُرد آں گنج بادآورد وغالب راہنوز
نالۂ الماس پاش وچشم گوہر بارہست

یہ سخن گستری نہ تھی، حقیقت کی جلوہ آرائی تھی۔

کلیم الحسن نقوی پرنٹر، انیس ہاشمی پبلشر انجمن پریس میں چھپا کر دفتر لیل ونہار عظمت منزل عقب سنٹرل کمرشل ایریا پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹ سے شائع ہوا۔

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

مزدور رہنماؤں کا اجتماع



محمد یامین



ڈاکٹر اعزاز نظیر



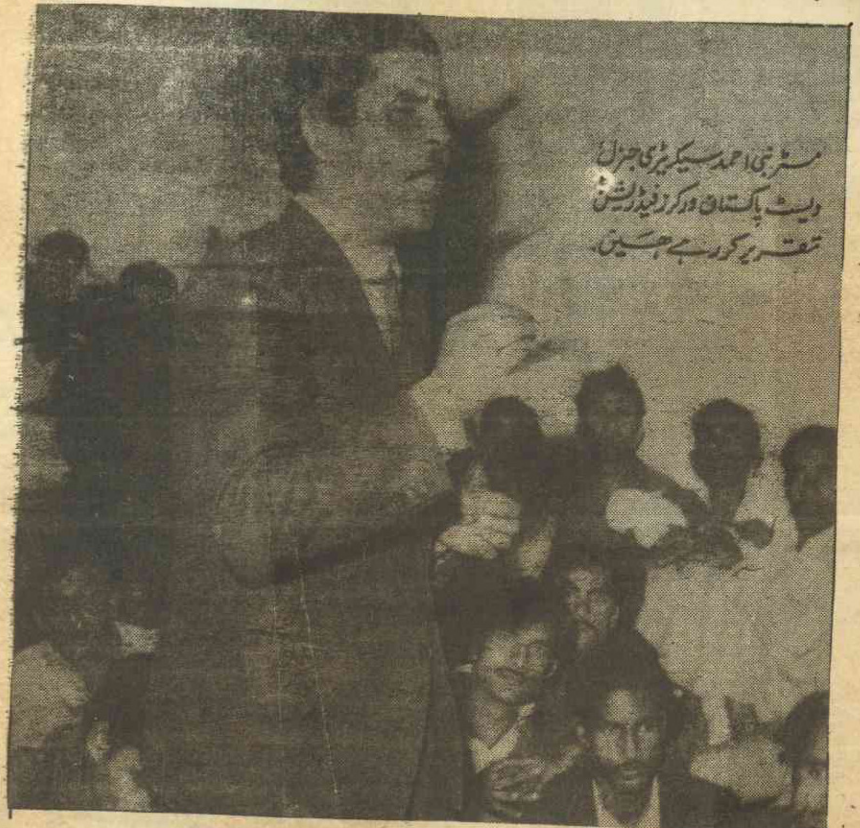
علی امجد ایڈووکیٹ



مسٹر غوث علی



فضل الرحمان



مسٹر نبی احمد سیکریٹری جنرل
ویسٹ پاکستان ورکرز فیڈریشن
تقریر کر رہے ہیں۔

Lailo Nahaar Newsweekly Registered as a Newspaper with the Post Office in United Kingdom